قُلِ اللّٰہُ ثُمَّ ذَرۡھُمۡ فِیۡ خَوۡضِھِمۡ یَلۡعَبُوۡنَ
خُلاصۃ السُّلُوک
از تالیف لطیف
مرزا محمد ابراہیم بیگ صاحب
شیدا وارثی

یا وارث حق وارث

خلاصۃ السلوک

از تالیف لطیف

مرزا محمد ابراہیم بیگ صاحب
شیدا وارثی

شبیه مرزا محمد ابراهیم بیگ شیدا وارثی که درعرصه حیات خودش از مهد
تا لحد یعنی ۱۲۸۱ھ تا ۱۳۶۴ھ لواء انوار تجلیات وارثی افراشت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

باہتمام جناب

فقیر حاجی عزت شاہ وارثی مدظلہ العالی

ناظم اعلیٰ آستانہ عالیہ وارثیہ چھپر شریف

ڈاکخانہ چنگا بنگیال، تحصیل گوجرخان ضلع راولپنڈی

تعداد : ـــــــــ ایک ہزار

سال اشاعت : ـــــــــ جون ۱۹۹۷ء

ناظم اشاعت : ـــــــــ انجمن وارثیہ بیول تحصیل گوجرخان، راولپنڈی

مطبع : ـــــــــ فورسنز پرنٹنگ پریس راولپنڈی 505162

کتاب ملنے کا پتہ

آستانہ عالیہ وارثیہ

حضرت حاجی و حافظ فقیر اکمل شاہ وارثی رح

چھپر شریف ڈاکخانہ چنگا بنگیال تحصیل گوجرخان

ضلع راولپنڈی پاکستان

بسم الله الرحمن الرحیم
رب لا تذرنی فردا و انت خیر الوارثین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ای نزہے ستر شانِ رب ودود   بے نشان ست وہم ہوالموجود
ذات پاک ست ذوالجلال وغنی   خالق وقادر وقدیم وقوی
جانِ عالم یگانہ لاریب است   مالک الملک عالم الغیب است
من چہ دانم کمال قدرت او   وحدہٗ لا آلہ الا ہوٗ

سبحان اللہ یہ بھی قدرتِ معبود ذوالجلال ہے کہ مُشت خاک کثیف کو حمد الٰہی کا خیال ہے۔ جو یقینی ناممکن بلکہ محال ہے۔ بقول

چون قدس خدائے لایزال است   پس دم زدنی کرا مجال است
دعوی کمالِ مر بشر را   در عالم قدس او محال است

لیکن حقیقت کو دیکھا جائے تو بے قصور ہوں۔ ہاں الفاظ کی غلطی ضرور ہے یہ سمجھنا لازم تھا کہ جب ہیژدہ ہزار عالم تجلی رب العزت سے معمور ہے خاک وباد نار ونور ہین اُس یگانہ گوہر درج وحدت کا ظہور ہے کائنات میں اُس کی قدرت کا اظہار ہے۔ وحدت میں کثرت کثرت میں وحدت آشکار ہے۔ پس جہاں دوئی کی گنجایش نہیں وہاں مَن وتُو کا دعویٰ کرنا بیکار ہے۔

کہ ہمون شاہد ہمون مشہود   غیر او نیست در جہان موجود

بلکہ یہ کہنا زیبا تھا کہ وہی حامد وہی محمود۔ وہی عبد وہی معبود۔ وہی مداح اور اسی کی مدحت ہے۔ وہی مہرِ چرخ وحدت وہی زیب بزم کثرت ہے۔ اسی بے نام کے ہزاروں نام۔ اسی بے نشان کا دلِ عاشق مقام ہے۔ وہی گل وہی خار۔ وہی موجدِ خزاں وہی خالقِ فصلِ بہار۔ وہی شیخ کا ایمان وہی برہمن کا دھرم وہی رونق دیر وہی زینت حرم۔ وہی صاحب ناز۔ وہی اہل نیاز۔ وہی طبیب وہی بیمار وہی دوا وہی آزار۔ وہی نار وہی نور۔ وہی شبلی وہی منصور۔ وہی صاحب احتساب۔ وہی سرمدِ خانہ خراب۔ وہی واجب الوجود تمام عالم کی جان ہے۔ اسی کی ذاتِ پاک کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ ہے۔ بقول

ہر لحظہ بشکل آن بتِ عیار برآمد دل بردو نہان شد
ہردم بہ لباسِ دگر آن یار برآمد گہہ پیر و جوان شد

خود کوزہ وخود کوزہ گر و خود گل کوزہ خود رندِ سبوکش
خود بر سرآن کوزہ خریدار برآمد بشکست روان شد

نے نے کہ ہمون بود کہ میگفت انا الحق درصورت منصور
منصور نبود آن کہ سردار برآمد نادان بہ گمان شد

وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ لَہُ الۡمُلۡکُ وَلَہُ الۡحَمۡدُ وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ

نعت سرور کائنات علیہ تحیۃ الصلوٰۃ

جن کی سمجھ خراب اور آنکھوں پر تعین کا دہرا حجاب ہے وہ شمع شبستان احدیت گلدستہ بوستان الوہیت۔ مجموعۂ صفات یزدانی مظہر ذات ربانی کو بلحاظ آنا

بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ عین ذات سے جُدا سمجھتے ہیں۔ بقول

کافران دیدند احمد را بشر
چون ندیدند از وی انشق القمر

رموز لطیفہ مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ اور اسرار نکتہ مَنْ رَّاٰنِیْ فَقَدْ رَاَی الْحَقَّ سے بالکل بے خبر ہیں۔ گو یہ نازک مسئلہ ضرور غور طلب ہے۔ مگر اپنا تو یہ مشرب ہے۔

حقا کہ ہمون بود کہ می آمد و می رفت ہر قرن کہ دیدی
تا عاقبت آن شکل عرب دار بر آمد دارای جہان شد

یہ بھی شاہد بے رنگی کا رنگ اور اُس کی انوکھی کارسازی کا ڈھنگ ہے کہ اُس نگار یکتا نے نرالی شان سے جلوہ گری فرمائی۔ عالم تعینات میں یہ صورت دکھائی۔ ؎

ز دریا موج گُونا گُون بر آمد
کہ بیچونی برنگِ چون بر آمد

صدر ایوان وحدت زیب بزم کثرت ہوا۔ یعنی حُسن ذات احدی نے حلیۂ صفات محمدی میں ظہور فرمایا۔ شاہد قدیم پردۂ اسرارِ غیب سے عالم شہود میں آیا

اے پردہ برگرفتہ بہ بازار آمدہ
خلقے درین طلسم گرفتار آمدہ

عالم انتظام کے واسطے صرف یہ انتظام ہے کہ نام کی تخصیص برائے نام ہے

اے مغربی آن یار کہ بے نام و نشان بُود   بے نام و نشان آمد و با نام و نشان شد

شریعت میں احمد حقیقت میں احد ایک معنی ایک مطلب سوائے ایک میم حجاب امتیازی کے جو پہلے تھا وہی اب ہے۔ اس لئے حمد و نعت ہمارے خیال میں ایک بات ہے:

من ذاتِ محمد را حقا ہمہ او خوانم
من صورتِ احمد را حقا ہمہ او دیدم

لیکن بزرگوں نے سرتابی کی ضلالت دکھائی ہے اور راہ ادب کی ہدایت فرمائی ہے کہ۔ ع بے ادب محروم گشت از لطف رب۔ بایں سبب اور بلحاظ اسباب عالم متقدمین کی تقلید بھی ضرور ہے کہ حمد کے بعد نعت کا دستور ہے۔ لہٰذا بکمال ادب اور دست بستہ حضرت شہنشاہِ بحر و بر محبوب داور۔ مقصود وجود کائنات بہبود نمود موجودات۔ شاہ ایوان جلال۔ یوسف کاروانِ جمال۔ خلیل جلیل رحمان دلیل سبیل عرفان۔ عالم علوم غیبی۔ کاتب کتب لاریبی، سالک مسالک سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی محرم اسرار فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی عجوبۂ کارستان وجود۔ مجموعۂ نگارستان شہود نسیم روضۂ محبت شمیم رائحہ خلت۔ معجز نمائے اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ آبرو افزائے اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ خاقان دیوان دَنٰی فَتَدَلّٰی سلطان ایوان مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی دُر دُرج اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ شرف برج فَلَا اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ وَالَّیْلِ وَمَا وَسَقَ صاحب قبائے بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ الرَّحِیْمُ حامل لوای اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۔ سید اصفیا۔ سند اصطفا۔ احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تسلیماً کثیراً کثیراً کی جناب میں بہ ہزار عجز و نیاز یہ عرض ہے کہ اے واقفِ اسرارِ الوہیت و کاشف استار ربوبیت حضور کی سرکار عاجز نواز و غربا پرور ہے لہٰذا تحفۂ درود کے ساتھ یہ عبد ذلیل و نادار اپنا دلِ اغدار

بھر نذر لایا ہے۔ اور امید ہے کہ

شاہا ز کرم برمن درویش نگر ؎

برمن منگر بر کرم خویش نگر +

اگر یہ ہدیۂ ناچیز قبول سرکار ہے تو واللہ اپنا بیڑا پار ہے

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ کَمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی

امابعد حقیر محمد ابراہیم شیدا وارثی خدمت ناظرین میں وہی مشہور اور قدیم ارشادات بزرگان دین پیش کرنا چاہتا ہے جس کی ہمیشہ حضرات صوفیۂ کرام و علمائے عظام نے بالاتفاق اور بلالحاظ مشرب و مسلک ہدایت فرمائی ہے۔ یعنی ہمارے پیشوائی دین حضرات عارفین و نیز علمائے محققین نے یہی تلقین فرمائی ہے کہ انسان کی غایت رفعت ایمان پر موقوف ہے۔ اور گنجینۂ ایمان کی کلید توحید جناب باری جل جلالہٗ کا یقین ہے ہمیشہ اور ہر مذہب کے پیشواؤں نے اپنی قوم کو صاف اور صریح الفاظ میں اسی تصدیق وحدانیت حضرت رب العزت کی ہدایت فرمائی ہے یہی ایک مسئلہ رکن ایمان اور ہر مذہب و ملت کی جان ہے بقول مولانا

مومن و ترسا و یہود و نیک و بد

جملہ گان راہست روسوئے احد

یہی مسئلہ شریعت کا کعبہ ہے اور طریقت کا قبلہ۔ اسرار حقیقت کا خزینہ ہے اور بام معرفت کا زینہ۔ اسی کی تصدیق باعث تقویت ایمان ہے۔ اسی کا یقین وسیلۂ عرفان و ایقان ہے۔ یہی مسئلہ انتہا کا آسان اور اسی کی تحقیق نہایت ادق ہے۔ یہی علم بے تعلیم آتا ہے اور جسکا سمجھنا دشوار ہے یہ وہی سبق ہے۔

ہست نادانی درین رہ علم نیست
علم را بگذار تا دانی یکیست

اول تو حقیقتِ رازِ توحید سمجھنا ہمارے فہم وادراک سے بعید ہے۔ علاوہ اس کے دشواری یہ ہے کہ اگر کوئی طالب راہ حق اسرار وحدت سے آگاہ ہوا۔ تو فورحیرت نے خاموش کیا بات کرنا شاق ہوا ع کانراکہ خبر شد خبرش باز نہ آمد کا مصداق ہوا۔ یا کسی سرشار بادۂ وحدت نے عالم وجد میں زبان ہلائی تو اس کا ثمرہ یہ ملا کہ حق بھی کہا تو اپنی گردن کٹوائی۔ غرض یہ بحر ذخار ناپیدا کنار ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں وہم وگمان مجبور اور عقل بیکار ہے بقول

رہ عقل جز پیچ در پیچ نیست
بر عارفان جز خدا ہیچ نیست

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تصدیق وحدانیت کو اصل ایمان فرمایا ہے اور اس کی تصریح طویل ودشوار کو فہم عوام کے لائق آسان لفظوں میں یوں سمجھایا ہے کہ توحید کے چار مدارج ہیں۔ اول مغز۔ دوم مغز کا مغز۔ سوم پوست۔ چہارم پوست کے اوپر کا پوست۔ اور اس کی مثال آپ نے ہمارے فہم وادراک کے لحاظ سے یہ دی ہے کہ توحید کو ایک اخروٹ سمجھ لو جس کے دو چھلکے اور اندر مغز اور مغز میں روغن ہوتا ہے۔ اسی طرح توحید کا پہلا درجہ صرف زبان سے لا آلہ الا اللہ کا اقرار کرنا ہے۔ اور دل سے غافل جیسے منافقین۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس کلمہ کی تصدیق بالقلب بھی ہو جیسے عام مسلمان۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ بہ امداد انوار حق توحید کے معنی بطور کشف مشاہدہ ہوجائیں۔ یہ مقام سالکین مقربین کا ہے۔

چوتھا درجہ صدیقین کا ہے کہ وجود افراد موجودات میں ماسوائے ذات واحد یکتا اُن کو کچھ نظر نہیں آتا۔

خویشتن را جلوہ کردی اندرین آئینہا
آئینہ اسمے نہادی خود نمودار آمدی

اسیکو حضرات صوفیہ کرام فنافی التوحید کہتے ہیں۔

لغوی معنی توحید کے بہت سی چیزوں کا ایک کرنا ہے۔ اور اصطلاح صوفیہ میں اضافات و نسبت کا ساقط کرنا ہے۔

بعض عارفین کا قول ہے کہ توحید کے معنی ایک کہنا۔ اور ایک دیکھنا ہیں معنی اول ایمان کے واسطے شرط ہیں کہ ایمان مبدا معرفت ہے۔ اور ایمان کے لئے توحید کی تصدیق لازم ہے یعنی یہ کہنا اور سمجھنا کہ اللہ ایک ہے اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰھًا وَّاحِدًا۔ اور دوسرے معنی یعنی ایک دیکھنا یہ مقربین خاص کے واسطے ہیں۔ یہ مرتبہ کمالِ معرفت اور بعد ایقان کے حاصل ہوتا ہے کہ موحد کو اپنے وجود بلکہ جملہ افراد موجودات میں بجز ذات حضرت باری جل جلالہٗ کچھ نظر نہیں آتا۔ تمام اشیاء عالم کو ایک دیکھتا ہے اور ایک جانتا ہے۔ اور وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ فِی الْوُجُوْدِ کا مرتبہ نصیب ہوتا ہے۔ اور زبان حال سے کہتا ہے۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝

یہ بھی حضرات عارفین کا ارشاد ہے کہ توحید کا تعلق حال سے ہے اِس کا اظہار بذریعہ قال ناممکن اور محال ہے۔ توحید کی جگہ سینہ میں ہے نہ سفینہ میں

توحید کی گنجائش نہ میدان تقریر میں ہے نہ احاطہ تحریر میں اور توحید علم قلب ہے چنانچہ حضرات عارفین نے توحید کے معنی اور اقسام اور مدارج جس قدر بیان فرمائے ہیں اُن کے سمجھنے کے لئے بھی ہماری عقل قاصر اور ہمارا ادراک ناکافی ہے۔

مولانا شاہ عبدالرحمٰن صاحب موحد صوفی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔ کہ توحید حضرت احدیت جل جلالہ کی چار قسمیں ہیں۔ اول توحیدِ شریعت کہ دلائل عقلی اور برہان نقلی سے پروردگارِ عالم کو واحد اور قدیم جاننا۔ دوم توحید طریقت کہ شہود افراد عالم سے وجود واجب الوجود کا اثبات کرنا سوم توحید حقیقت کہ اپنے وجود کا ادراک بھی نفی ہو جائے تعینات ہستی فنا ہوں۔ ماسوای ہستی حضرت باریتعالیٰ کچھ باقی نہ رہے بقول

درصورتِ ہر مجنون باسوز ہم اوآمد
درکسوتِ ہر لیلیٰ زیبا ہمہ اودیدم

چہارم توحید معرفت۔ جب سالک مقام فنافی اللہ سے عروج کرتا ہے تو اپنی ہستی کو عدم محض پاتا ہے اور خودی سے بیخود ہو جاتا ہے۔

ع چون پردہ برافتد نہ تو مانی و نہ من۔ کا مضمون صادق آتا ہے ۔اسی کو حضرات صوفیہ کرام۔ توحید ازلی۔ توحید ذاتی۔ توحید قدیمی۔ توحید آلہی بھی فرماتے ہیں۔

اکثر حضرات موحدین نے توحید کی یہ چار قسمیں ارقام فرمائی ہیں۔ توحید ظلی توحید عینی۔ توحید شہودی۔ توحید وجودی۔ اور اِن اقسام کی وضاحت نہایت شرح وبسط کے ساتھ کی ہے۔ خصوصاً توحید وجودی جو بہت دشوار اور نازک مسئلہ ہے اور یہ امر قطعی ہے کہ اوصاف توحید وجودی سراپا عرفان باطن اور وجدانی سے تعلق رکھتے ہیں۔ مگر ہمارے ادراک کے موافق اس مسئلہ توحید وجودی

کو خلاصہ اور مختصر الفاظ میں یوں بیان فرمایا ہے کہ ہماری ہستی حقیقی واحد ہے مگر ایک وجود باطنی اور ایک وجود ظاہری ہے۔ وجود باطنی محض نور ہے جس کو موجودات کی جان کہنا چاہیئے۔ اور اُسی نور کا عکس یہ وجود ظاہری ہے۔ جو شہود اور ممکنات کی صورت میں نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کثرت کی وہی وحدت یعنی وجود باطنی ہے۔ اور اس کثرت اعتباری کا وجود اُسی وحدت حقیقی سے ہے چنانچہ اسی مسئلہ کو تمثیل کے ساتھ مولانا نے بھی لکھا ہے۔

تو بدان کین تن بود اندر لباس	روح را اولابس آمد در قیاس
تن بود چون سایہ و جان شخص آن	سایہ را بے شخص خود نبود توان
قامت تو بر قرار آمد بساز	سایہ ات کوتہ دمی یکدم دراز
روح را توحید اللہ خوشتر است	غیر ظاہر دست و پای دیگر است

بعض عشاق کا فرمودہ ہے کہ توحید کے معنی یہ ہیں کہ اتحاد اور یگانگی ہو از روے حقیقت نہ از راہ صورت۔ حالانکہ صورتاً طالب و مطلوب میں تفاوت ہے۔ ایک مظہر نیاز دوسرا منبع بے نیازی۔ مگر درحقیقت عاشق و معشوق میں اتحاد ازلی اور حقیقی ہوتا ہے۔ جیسا آئینہ۔ گو بظاہر سادہ اور بے صورت ہوتا ہے اور بے صورتی ضد ہے صورت کی لیکن درمیان صورت اور آئینہ کے اتحاد حقیقی ہے۔ لہذا حالت استغراق میں عاشق بحضور معشوق بوصال و متحد ہوتا ہے اور دوئی معدوم ہوتی ہے

در صفائی می و لطافتِ جام	درہم آمیخت رنگ جام مدام
ہمہ جام است نیست گوئی می	یا مدام است نیست گوی جام

یہ اتحاد حقیقی وہ ہے کہ اغیار کو جس کا شہود اور امتیاز نا ممکن ہے بقول

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین راہم خبر نیست

اصطلاحی معنی اس اتحاد کے یہ سمجھنا چاہئے کہ عاشق نورواجب الوجود کے آگے اپنی ہستی کو فنا کرے اور اس کو ماسوا معشوق جملہ تعلقات موجودات عالم سے تجرید اور انقطاع حاصل ہو۔ جیسا مجنون کہ عشق لیلےٰ میں ایسا محو اور مستغرق ہوا کہ اُس کو درمیان اپنے اور لیلیٰ کے امتیاز نہ رہا چنانچہ مولانا علیہ الرحمہ نے اپنی مثنوی میں یہ قصہ لکھا ہے۔

جسم مجنون را زہجر و دُور رئیے — اندر آمد ناگہان رنجور رئیے
خون بجوش آمد ز شعلہ اشتیاق — تا پدید آمد برو مجنون خناق
پس طبیب آمد بدار و کردنش — گفت چارہ نیست ہیچ از رگ زدنش
بازوش بست و گرفت آن نیش او — بانگ برزد ناگہان آن عشق جو
گفت آخر از چہ می ترسی ازین — چون نمی ترسی تو از شیر عرین
گفت مجنون من نمی ترسم زنیش — صبر من از سنگ خارا ہست بیش
لیک از لیلیٰ وجود من پُراست — این صدف پُر از صفات آن دُراست
ترسم ای فصاد اگر فصدم کنی — نیش را ناگاہ بر لیلےٰ زنی
داند آن عقلے کہ او دل روشنیست — درمیان لیلیٰ و من فرق نیست

اور بعض عارفین کا ارشاد ہے کہ توحید نہایت مقامات اور غایت غایات رُوح انسانی ہے۔ اور توحید کی تین قسمیں ہیں۔ اوّل توحید شرعی یعنی اثبات وحدانیت جناب باری جل جلالہٗ۔ دوم توحید عقلی یعنی اثبات ذات خدا کیساتھ

غیر کی نفی کرنا۔ سوم توحید کشفی یعنی اثبات وجود واجب الوجود

اکثر موحدین نے اس کی تصریح یوں فرمائی ہے کہ توحید کے چار مرتبے ہیں توحید مثالی توحید استدلالی۔ توحید حالی۔ توحید ذوالجلالی۔ اور توحید مثالی کو توحید ایمانی بھی کہتے ہیں۔ اور شان توحید مثالی کی یہ ہے کہ سالک بہ مقتضائے اشاراتِ آیات و اخبار توحید اور الوہیت پروردگار کی بہ سبیل تقلید کرے۔ یہ توحید مستفاد علم ظاہری سے ہے۔ اور بسبب خلاصی شرک جلی ہے۔ اور توحید استدلالی کا جس کو توحید علمی بھی کہتے ہیں مستفاد علم باطن سے ہے۔ اس علم کو علم الیقین بھی کہتے ہیں۔ تعریف اس کی یہ ہے کہ بہ ہدایت حضرات صوفیہ سالک کا مذاق طریق تصوف کے موافق ہو اور بہ دلائل و براہین یہ کامل یقین ہو کہ موجود حقیقی اور موثر مطلق خداوند عالم ہے۔ اور جملہ افعال وصفات موجودات کو فعل اور صفت معبود حقیقی سمجھے۔ اور توحید حالی کی شرح یہ ہے کہ موحد کے واسطے حال وصف توحید لازم ہے پہلے غلبۂ اشراق انوار توحید محسوسات افراد موجودات کو مضمحل کرتا ہے۔ پھر وجودِ موحد مشاہدۂ جمال واجب الوجود میں ایسا مستغرق اور عین جمع ہوتا ہے کہ بجز انوار ذات اور کرشمۂ صفات واحد یکتا کچھ نظر نہیں آتا۔ اس مقام پر موحد اپنا وجود مفقود دیکھتا ہے اور بصورت قطرۂ متلاطم امواج بحر توحید میں غرق ہوتا ہے۔ اور جب فنا حاصل ہوتی ہے تو مرتبہ بقائے کامل کا نصیب ہوتا ہے۔ جیسا کہ آگ میں جب لوہے کو گرم کرو تو لوہا خود آگ ہو جاتا ہے۔ جسکا اشارہ مولانا کے ان اشعار میں ہے۔

چیست توحیدِ خدا آموختن — خویشتن را پیش واحد سوختن

گر ہمیں خواہی کہ بفروزی چو روز — ہستی ہمچون شب خود را بسوز

ہستیت در ہست ہستی نواز ہمچو مس در کیمیا اندر گذار

اس مقام پر عارف کو کثرت تعینات مانع وحدت نہیں ہوتے بقول

یک روی در صد آئینہ گر میکند ظہور

آئینہا صد ست دے رو ہمان یکیست

رائی و مرئی و مرات در رویت میں امتیاز حیثیت تعین نہیں رہتا۔

ع "معشوق و عشق و عاشق ہر سہ یکیست اینجا"

توحید ذوالجلالی کی تصریح دشوار بلکہ محال ہے۔ لیکن بالاجمال اسکو یوں خیال کرنا چاہیے کہ حق تعالیٰ جل جلالہ بوصف وحدانیت و فردانیت موصوف تھا اور آج بھی واحد اور فرد ہے۔ اور اَلْآنَ کَمَا کَانَ ہمیشہ صفت وحدنیت و فردانیت سے موصوف رہیگا کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ یہی توحید حق اور یہی حق توحید ہے۔ یہاں عبارت اور اشارت کا دخل نہیں۔ تمام چون و چرا اور یا رے بیچونی میں غرق ہوجاتے ہیں كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ

ہست بے رنگی اصول رنگہا صلحہا باشد اصول جنگہا

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد موسی با موسی در جنگ شد

صبغۃ اللہ ست رنگ خم ہو رنگہا یکرنگ گرد ندا ندر رد

گرد و چشم حق شناس آمد ترا دوست پر بین عرصۂ ہر دو سرا

از ہمہ اوہام تصویر ست دور نور نور نور نور نور نور

گر ترا چشمے ست بکشا در نگر بعد لا آخر چہ می باید دگر

لا الٰہ گفت و الا اللہ گفت گشت الا اللہ ہو وحدت شگفت

این سخن پایان ندارد صبر کن تا بیابید ذوقِ علم من لدن

بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ توحید کی یہ تین قسمیں ہیں۔ توحید افعال توحید صفات۔ توحید ذات۔ اور ان اقسام کی تصریح میں لطائف صوری اور نکات معنوی بکثرت بیان فرمائے ہیں۔

بعض عارفین نے فرمایا ہے کہ توحید تکملۂ ایمان کا نام ہے اور یہ مقربین خاص کا مقام ہے۔ اور موحد کو کمالِ توحید کے بعد مرتبہ اتحاد کا نصیب ہوتا ہے۔ کیونکہ باعتبار بزم توحید خلوت اتحاد شائبہ تکلف سے پاک ہے۔ اللہ جل جلالہٗ کے بحر یگانگی میں غرق ہو کر موحد کا جانب بے وجہی التفات ہوتا ہے جس کو ایک ہونا کہتے ہیں۔

در آئینہ وحدت چند انکہ نظر کردم

او را ہمہ او دیدم خود را ہمہ او دیدم

اس کے بعد صدر وحدت ہے۔ اتحاد اور وحدت میں یہ فرق ہے کہ اتحاد کے معنی ایک ہونا ہیں جس میں کسی قدر بوئے کثرت آتی ہے۔ اور وحدت میں یہ تکلف بھی نہیں ہے۔ مقام وحدت میں۔ سکون۔ حرکت۔ ذکر۔ فکر۔ سیر سلوک۔ طلب۔ طالب۔ کمال۔ نقصان کا نام و نشان نہیں ہے۔

لیکن میری غرض اس تشریح اور تصریح سے یہ نہیں ہے کہ توحید کے اقسام اور آثار اور اس کے مدارج اور نکات لکھنے کی جرات کروں بلکہ میرا یہی ایمان ہے کہ توحید علم قلب ہے، جو تحریر میں نہیں آسکتا۔ اور عبارت سے اس راز الٰہی کا اظہار ناممکن اور محالات سے ہے۔ بقول

بردار ای زاہدِ خود بین کہ ز چشم من و تو
راز این پردہ نہاں است و نہاں خواہد بود

لیکن مقصود میرا یہ ہے کہ انسان مظہر ذاتِ جناب باری جل جلالہ ہے کہ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ جس کی دلیل ہے۔ اور اسی ہیکل جسمانی میں وہ ودیعت پروردگار عالم پوشیدہ ہے کہ جس کی شہادت آیہ وافی ہدایہ فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ سے بین طور پر ظاہر ہے۔ لہذا ہم کو لازم ہے کہ قید تعینات سے آزاد ہونے کی سعی اور کوشش اور اپنی اصل سے ملنے کی جستجو اور بقدر استعداد توحید حضرت واجب الوجود کا علم اور تصدیق حاصل کرنے کی فکر کریں کہ حیات مستعار کی یہ مدت قلیل غفلت میں نہ برباد ہو۔ اور ندامت ابدی نہ اٹھائیں۔

زبانِ خوش دلے دریاب و دریاب
کہ دائم در صدف گوہر نہ باشد

کیونکہ جملہ موجوداتِ عالم خالق بیچون نے انسان کیواسطے پیدا کیا۔ اور انسان کو اپنے واسطے۔ پس ہمارا فرض عین ہے کہ دریائے طلب میں جویائے دُرِ مطلب ہوں۔ اور اس بزم عالم میں رہکر اُس شاہد یکتا کو تلاش کریں جو کائنات کی جان بلکہ عین ایمان ہے۔ اگر عنایت رب العزت شامل حال ہے تو جستجو بے کار نہ جائیگی کہ جو یندہ یابندہ مشہور ہے۔ بقول حضرت مولانا علیہ الرحمۃ۔

سایۂ حق بر سرِ بندہ بود	عاقبت جوینده یابنده بود
گفت پیغمبر کہ چون کوبی درے	عاقبت از در بردن آید سرے
چون نشینی بر درِ کوئی کسے	عاقبت بینی تو ہم روئی کسے

چون زچاہ بے مکینی ہر دو زخاک　　　　عاقبت اندر رسی در آب پاک

گو یہ امر بھی قطعی ہے کہ توحید کی تکمیل اور ایقان و دیعت حضرت رب جلیل کی کامل تصدیق ریاضت اور مجاہدت پر نہیں موقوف ہے بلکہ مدار اس یافت اور وصول دیدار کا عنایت پروردگار پر منحصر ہے ہماری سعی اور کوشش ایک خیال سے بیکار بھی ہے۔ مگر حضرات محققین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ انسان کی رسائی بجناب قدس الٰہی دو طریق سے ہوتی ہے۔

اول صورت وصالِ شاہد یکتا محض افضال خدا پر موقوف ہے لیکن دنیا چونکہ عالم اسباب ہے جس کے لئے واسطہ اور وسیلہ بھی لازمی ہے لہذا مصلحت حق سبحانہ تعالیٰ نے یہ انتظام کیا کہ روز ازل سے جو نظر کردہ ہیں اُن کو یہ مرتبہ فقیر صاحب دل کے توسل سے اس عالم ظاہر میں نصیب ہوتا ہے۔ کہ اُن کو مرشد کامل ایک نظر اور ایک آن واحد میں بے رنج ریاضت اور بغیر شدت مجاہدت بادۂ اسرار وحدت سے سرشار اور ماہیتِ افرادِ موجودات سے خبردار کرتا ہے۔ یہ حضرات میدان صفات سے جب عروج کرتے ہیں تو بعنایت مرشد اُن کو مقام عین الجمع میں ذات کردگار سے سروکار ہوتا ہے۔ مشاہدۂ جمال ذوالجلال اور بی یسمع و بی یبصر کا مرتبہ نصیب ہوتا ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۔

اس انتظام الٰہی سے ایک سبق ہم کو یہ بھی ملتا ہے کہ خدا کا ملنا فقیر کے ملنے پر موقوف ہے۔ اور مشہور بھی ہے ؎ ہر کہ فقیر را یافت خدای را یافت

سبحان اللہ کیا مرتبہ فقرا کا ہے۔

حافظ اینجا بہ ادب باش کہ سلطان و ملک

ہمہ در بندگی حضرتِ درویشان است

چنانچہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے بھی اپنی مثنوی میں ہم کو یہی ہدایت فرمائی ہے

ہر کہ خواہد ہمنشینی با خدا — گو نشیند اندر حضورِ اولیا

چون شوی دور از حضورِ اولیا — در حقیقت گشتۂ دور از خدا

بندۂ یک مردِ صاحبدل شوی — بہ کہ بر فرقِ سرِ شاہان روی

گر تو سنگِ صخرہ مرمر شوی — چون بہ صاحبدل رسی گوہر شوی

اور طریقِ ثانی ریاضت اور مجاہدت کا محتاج ہے۔ اس لئے کہ اکثر طالبان راہ خدا کو بہ سبیل ریاضت اور مجاہدت بھی معرفت حضرتِ حکیم مطلق نصیب ہوئی اور مرتبہ علیا حاصل ہوا ہے۔ بقول حافظ

قومے بجد و جہد گرفتند وصل دوست

قومے دگر حوالہ بہ تقدیر میکنند

لہٰذا طالبِ راہ طریقت کو لازم ہے کہ بہ کمال ثبات و استقلال بپیشوای صاحب دل سے طریق واصلانِ حق دریافت کرے اور موافق ہدایت مرشد کامل ریاضت اور مجاہدت میں سرگرم رہے۔

بہ می سجادہ رنگین کن گرت پیر مغان گوید

کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

بعد محنت بسیار اور کوشش دشوار اگر فضل پروردگار شامل حال ہو تو

صورتِ شاہد امید آئینہ ظہور میں ضرور نظر آئیگی۔

لیکن بعض حضرات سالکین نے طریق اول الذکر کی نسبت اس قدر صراحت اور فرمائی ہے کہ اس طریق میں بھی دو گروہ ہیں ایک گروہ تو وہ ہے جو بوساطت مرشد کامل ایک آن واحد میں واصل بذات احدیت ہوتا ہے جیسا اوپر مذکور رہوا۔ اور گروہ ثانی وہ ہے جو بے وسیلہ اور بغیر کسی واسطہ اور انتظام کے فیضیاب اور فائز المرام ہوتا ہے اسی کو عنایت وہبی اور تشریف ازلی کہتے ہیں۔ کیونکہ توحید کی دو قسمیں ہیں ایک شرع توحید اور ایک حق توحید گوہر شرع توحید دریائے ولایت میں ملتا ہے۔ اور حق توحید قلزم محیط ہے اس بحر ذخار ناپیدا کنار میں وہ کشتی چلتی ہے کہ ناخدا جسکا خدا ہو۔ شرع توحید بمنزلہ چراغ کے ہے کہ ایک دوسرے سے جلتا ہے۔ چنانچہ اس راہ میں بھی بوسیلہ افادہ و استفاضہ ہوتا ہے۔ بقول

کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آن یار آشنا را

اور حق توحید مثل آفتاب کے ہے جس کو واسطہ اور ذریعہ کی حاجت نہیں

چہ گوئمت کہ بمیخانہ دوش مست خراب
سروش عالم غیبم چہ مژدہا داداست

غرض یہی مقبولان بارگاہ احدیت و محبوبان حضرت رب العزت جن کو سعادت سرمدی نصیب ہوئی اور عنایت وہبی نے سرفراز کیا ہے یقینی خدا رسیدہ اور برگزیدہ خاص ہیں۔ مقربان حق صاحبِ عرفانِ

فرد الافراد کامل الایقان ہیں اسرار حقیقت سے آگاہ واقف مقام لی مع اللہ ہیں۔ شہسوار معارک تجرید۔ تاجدار کشورِ توحید ہیں۔ انسان کامل انہیں کو کہنا روا ہے خلعت کرمنا بنی آدم انہیں کے تنِ اطہر پر زیبا ہے۔

اس برگزیدہ اور ممتاز گروہ میں جمیع حضرات کے شائستہ خیال کا گو نتیجہ اور مآل ایک ہی ہوتا ہے۔ مگر "ہر گلے را رنگ و بوے دیگر ست" کا مضمون ہے۔ قسام ازل نے جو مدارج اور مراتب اپنے واصلان خاص کے واسطے تجویز فرمائے ہیں اس عالم اسباب میں وہی نسبت اُن کی رفیق اور وہی مذاق اُن کا خاص طریق ہوتا ہے۔ لہذا انہیں مقربین بارگاہ صمدیت میں بعض ذی مرتبت جو درحقیقت عالی حوصلہ اور بلند خیال ہوتے ہیں وہ دلدادۂ شان جمال حضرتِ ذوالجلال ہوتے ہیں کہ شوقِ وصال شاہد حقیقی میں قید ہستی سے آزاد ہوکر مردانہ وار عشق کے قلزم ناپید اکنار میں قدم دھرتے ہیں۔ گوہر مقصود کو نیستی کے بحر ذخار میں تلاش کرتے ہیں۔ بہ کمال تحمل و استقلالِ فراق کے ناقابلِ برداشت رنج و ملال سہتے ہیں اور ہمیشہ پابند تسلیم شاہد غیبی و کاربند رضائی مطلوب حقیقی رہتے ہیں۔ جملہ تعلقات سے تجرید و تخلیص اور تمام مرادات و مطلوبات سے فراغ اور معلومات و معقولات سے انقطاع حاصل کرنے کے بعد محو تجلیات انوار اور ماسواء یار تمام عالم سے بالکل بے سروکار رہوتے ہیں بقول حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمہ

ہر کہ از خود شد مجرد در طریق عاشقی
از غم دور دش چہ آگاہی و بادرمان چہ کار

گرمئی عشق و شعلۂ اشتیاق وصال جملۂ موجودات کے خیال کو زائل و معدوم

کرتا ہے اَلعِشقُ نَارٌ تُحرِقُ مَاسِوَی المَحبُوب۔

عشق آن شعلہ ست کو چون برفروخت

ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

نام یار در دزبان خیالِ دلدار تقویت جان ہوتا ہے۔ ملت شیخ سے کام نہ مشربِ برہمن سے سروکار۔ دیر کے معتقد نہ حرمتِ حرم محترم سے انکار

عاشق ہم از اسلام خرابست و ہم از کفر

پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

نہ خوفِ عذاب۔ نہ تمنائے ثواب۔ نہ خیال رسوائی۔ نہ شوقِ پارسائی

نہ دارم ذوقِ رندی نے خیالِ پاکدامانی

مرا دیوانہ خود کن بہر رنگے کہ میدانی

عشق ان کا مذہب۔ عشق ان کا مشرب۔ عشق سے سروکار عشق سے مطلب۔ عشق انکا سرمایۂ ناز۔ عشق انکا انجام عشق انکا آغاز۔ عشق انکا دین۔ عشق انکا ایمان۔ عشق انکی روح۔ عشق انکی جان۔ عشق ہی کے نام پر مرتے ہیں اور عشق ہی کا دم بھرتے ہیں۔ اور جوشِ مستی میں کہتے ہیں۔

مرحبا اے عشق خوش سودائی ما | اے طبیبِ جملہ علتہائے ما

ای دوائی نخوت و ناموس ما | ای تو افلاطون و جالینوس ما

بہشت کا شوق نہ دوزخ کا خطر۔ راحت کی خوشی نہ رنج کا ڈر۔ نہ طلبِ عزوشان۔ نہ کوشش نام ونشان۔ نہ دنیا کی جستجو۔ نہ دین کی گفتگو۔

فاش میگویم داز گفتۂ خود دلشادم | بندۂ عشقم داز ہر دو جہاں آزادم

عقل و خرد سے دُور یاد و طلب میں مسرور۔ صاحب درد۔ بیابان نورد قیس کے ہم خیال فرہاد کے ہم مشرب۔ نہ کسی سے غرض نہ کسی سے مطلب نہ کسی کے مقلد نہ کسی سے بدظن۔ نہ کسی کے دوست نہ کسی کے دشمن۔

شداست سینۂ ظہوری پراز محبتِ یار
برای کینۂ اغیار در دلم جا نیست

یہ مبتلائے الم نشانۂ تیرِ غم۔ ما دستمار سے نفور۔ یادِ محبوب میں مسرور رہتے ہیں۔

ما قصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

مراد اُن کی نامرادی۔ عروج انکا بربادی۔ کام انکا ناکامی۔ عزت اِن کی بدنامی۔ خودی سے بیخود دوئی سے دور۔ نیاز پر ناز عنایت پر مغرور۔ فکر اِن کی بے فکری۔ شغل ان کا بے شغلی۔ صبح و شام یادِ مطلوب سے کام مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا فَقَدْ اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ۔

نہ گفت نہ شنید نہ کشف نہ دید۔ نہ خود رائی نہ کسی کی تقلید۔ نہ تشبیہ کا خیال نہ تنزیہ کی حاجت بے واسطہ ذات سے سروکار۔ عبادت انکی دیدار یار مذہب اِنکا رضائے دلدار۔

عاشقان اندر عدم خیمہ زدند
چون عدم یکرنگ نفس واحداند

طریق اِنکا جداگانہ۔ خیال اِنکا رندانہ۔ تقریر اِن کی محبت آمیز

تحریر ان کی دلولہ انگیز۔ بے پروائی کی عادت۔ خود آرائی سے نفرت مزاج پرجوش۔ طبیعت غیور۔ سادگی پسند نمود و شہرت سے نفور۔ دوست کی شناخت نہ دشمن کا امتیاز۔ سب کے ساتھ ایک انداز۔ صاحب خلق و کرم۔ مرد میدان رضا۔ تسلیم میں ثابت قدم۔

کس خوشی سے یہ غم و رنج والم سہتے ہیں
سرنگون بر سر تسلیم و رضا رہتے ہیں

طاعت اِن کی نرالی۔ عبادت اِن کی حالی۔ چنانچہ علاوہ ظاہری قیود کے حقیقی وضو اِن کا یہ ہے کہ میل ہوا و حرص سے ظاہر ان کا صاف اور باطن وسواس خودی اور خطرات دوئی سے پاک۔ ہر آن میلان طبیعت جانبِ رب العزت۔ خطاب اِن کا طاہر السر و طاہر الجیعتہ ہے وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ

خاطر خویش پاک کن بوضو	باطن خویش را نماز گذار
پس وضو چیست فکر کردن دل	صافیِ دل جدا شدن ز اغیار
مسجد تو مقام تسلیم است	قبلہ گاہ تو طاق ابروی یار

علیٰ ہذا حقیقت میں نماز ان کی یہ ہوتی ہے کہ ماسوا رب السموات جملہ موجودات سے انقطاع تعلقات۔ اور بحر شہود حضرت واجب الوجود میں استغراق۔ جو قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ کی مصداق ہے بقول

مرا غرض ز نماز آن بود کہ یک ساعت	غم فراق ترا با تو راز بگذارم
دگر نہ این چہ نمازے بود کہ من بی تو	نشستہ روئی بمحراب و دل بہ بازارم

عاشق جمالِ حضرتِ احدیت و صاحب سکر و کیفیت کا نیاز حقیقت میں

عین نماز ہے

در کوی خرابات کسی راکہ نیاز است
ہشیاری و مستیش ہمہ عین نماز است

یادِ محبوب و تصورِ مطلوب میں ہمہ تن مصروف ہونا اور اپنی خودی کو مٹانا یہی طریقِ محبت میں عاشقوں کا فرض پنجگانہ ہے۔ جس کا ذکر مولانا علیہ الرحمتہ اپنے اس مصرع میں فرماتے ہیں ع نماز عاشقان ترک وجود است۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ ہستی مقصودِ حقیقی کے سامنے اپنے شعور وجود کو نیست اور نابود کرنا۔ بلکہ فنای وجود کو بھی صفحہ علم و شہود سے معدوم اور نا معلوم کرنا جس کو حضرات صوفیہ فناء الفنا کہتے ہیں۔ اور بعض عارفین نے فرمایا ہے کہ بقای کامل اور بقای ذاتی بھی اسی مرتبۂ علیا کا نام ہے اور یہ مخصوص عاشقانِ صادق کا مقام ہے۔

اور کعبہ عشاق حرم جانانہ ہے۔ چنانچہ عشاق کا حج بھی اپنی صورت میں فرد اور نوعیت میں یگانہ ہے۔ یعنی حج عوام قصد کرنا سمت کوی دوست ہے اور حج عشاق میلان طبیعت اور قلبی محویت جانبِ روی دوست ہے۔ کعبۂ آب و گل محل طواف خلائق ہے۔ اور حرم سرایے دل مطافِ الطافِ خالق ہے۔ وہ مقصد زوار ہے۔ یہ مہبطِ انوار ہے۔ وہ خدا کا مجازی گھر ہے۔ اور یہاں خود صاحب خانہ جلوہ گر ہے۔ وہ خانۂ خلیل ہے۔ اور یہ حرم رب جلیل ہے۔ اسکا طواف آسان ہے۔ اور اسکا طواف کار مردان ہے۔

حج زیارت کردنِ خانہ بود
حج رب البیت مردانہ بود

مسجدی اندر درونِ اولیاست　　　سجدہ گاہے جملہ است آنجا خداست

اسیطرح حضراتِ عاشقین کا روزہ بھی عوام کے روزہ سے بہت زیادہ لطیف اور نہایت سخت اور دشوار ہے۔ یعنی سوائے امساک طعام احتیاط وسواس واوہام بھی لازمی ہے۔ اور بلاقید ماہ صیام ہمیشہ جملہ موجودات سے عدم التفات بھی ضروری ہے۔ جس کے لئے نہ ماہ وسال کی تکرار ہے۔ اور نہ اس روزہ کا وقت افطار ہے۔ بلکہ افطار دیدار یار ہے۔

اور زکوۃ مشربِ عشاق میں یہ ہے کہ مال و دولت سے نفور۔ آلائش اسبابِ دنیا سے دُور۔ ظاہر بھی تکدر خواہشات اور میل مرادات سے صاف اور باطن کبر و کینہ سے شفاف۔ گنجینۂ صدر جواہر صبر اور زر فقر سے معمور قلب یادِ محبوب سے مسرور۔ حساب کا ڈر۔ نہ روز حساب کا خطر۔ سرکار احدیت سے معافی دار یہی ذی اساس ہیں۔ "بردہ دیران خراج و عشر نیست" کے پروانے انکے پاس ہیں

اور یہی راہ رضا و تسلیم کے غازی شجاع ازلی ہیں کہ اپنی نفس کشی کو جہاد جانتے ہیں۔ کفرِ خیالِ غیر کو زائل اور برباد کرتے ہیں بنعرۂ یا محبوب وآوازہ یا مطلوب کا ڈنکا بجاتے ہیں۔ افسرانِ حواسِ خمسہ اِن کی اطاعت اور فرمان برداری کا دم بھرتے ہیں اقلیم دل میں یہ شہنشاہ عشق کا سکہ جاری کرتے ہیں۔ یہی کشتگان ابروئے یار خنجر مُوتُوا قَبْلَ اَنْ تَمُوتُوا کے شہید ہیں۔ اور انہیں مجاہدین کے واسطے بَلْ اَحْیَاءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ہ کا خطاب ہے

الحاصل جملہ اعمال اور تمامی خیال ان کے نہایت لطیف اور غایت درجہ کے نازک ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرات عاشقین کا ذکر و شغل بھی ہمارے

اوراد و وظائف سے بدرجہا بہتر اور افضل ہوتا ہے۔ اِن کے اشغال روحانی۔ اور اذکار حالی۔ ہمارے اور اد غرضی اور وظائف قالی ہوتے ہیں۔ لہذا مشرب عشاق میں ماسوا محبوب جملہ افراد موجودات کو فراموش کرنا یہی ذکر مطلوب ہے جس کے لئے نہ کسی ظاہری قاعدہ کی ضرورت نہ وقت کی قید نہ شمار اعداد کی دقت ہے۔ بلکہ یہ حضرات عالم وجد اور حالتِ کیف میں بکمال اشتیاق اپنے اپنے خیال اور مذاق کے لحاظ سے فکر مقصود حقیقی اور ذکر شاہد غیبی بہزار عجز و نیاز اور نرالی شان اور عجیب انداز سے کرتے ہیں گو تقریر مشہور اور معمولی الفاظ کے پردہ میں ہوتی ہے مگر معنوی پیرایہ میں اسکا دوسرا طور اور اصطلاحات میں مفہوم کچھ اور ہوتا ہے۔ ہر جملے سے محبت یار اور ہر فقرہ سے ذوق نظارہ دلدار ہویدا اور آشکار۔ حرف حرف میں تمنائے دیدار ہوتی ہے۔ اس لئے وہ شکایت بھی مزیدار ہوتی ہے۔

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

انکی ظاہری بول چال کو خلاف ادب خیال کرنا ہماری بدگمانی اور صریح نادانی ہے

گفتگوی عاشقان در کار رب
جوشش عشق ست نے ترک ادب

چنانچہ حضرت مولانا جلال الدین رومی قدس اللہ سرہٗ نے اپنی مثنوی میں اُس چرواہے کا قصہ نہایت تشریح اور تصریح کے ساتھ نقل فرمایا ہے جو عہدِ حضرت موسیٰ علیہ السلام میں بہ کمال ذوق و شوق اپنے خیال کے مطابق

تصور مطلوب کے عرض حال کر رہا تھا۔ حالانکہ یہ قصہ بہت مشہور ہے لیکن اس مقام پر اعادہ اس کا شاید بے محل نہ ہوگا۔

کہ سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ جنگل میں ایک آوارۂ دشتِ محبت۔ رنجور دردِ الفت۔ اسیر دام زلف محبوب۔ شہیدِ خنجر ابروی مطلوب مسکین و غریب۔ مہجور و فرقت نصیب۔ ہمہ تن اشتیاق بیاد دلدار میں استغراق۔ نہ تن کی فکر نہ جان کا ہوش۔ خیالِ یار سے ہم آغوش۔ ہجر جانانہ میں بیقرار۔ حسرت دید میں اشکبار۔ نہ مونس نہ مددگار۔ تصور یار غمخوار۔ محو نظارہ جمال ہے ذوق و شوق میں یہ حال ہے۔ کہ خودی سے بیزار۔ تکلف سے دست بردار۔ بار ہستی سے سبکدوش۔ بادۂ فنا سے مدہوش۔ نہ بیوفائی کا گلہ نہ بے پروائی کی شکایت۔ نہ اپنا قصہ نہ اپنی حکایت۔ بمقتضائے محبت۔ ستائش رب العزت کا دم بھرتا ہے۔ حسب حال اپنی زبان میں عرض کرتا ہے

دید موسیٰ یک شبانے را براہ ۔۔۔ کو ہمیگفت ای خدا وای آلہ
تو کجائی تا شوم من چاکرت ۔۔۔ چارقت دوزم کنم شانہ سرت
ای خدای من فدایت جان من ۔۔۔ جملۂ فرزندان و خان ومان من
جامہ ات دوزم سپشہایت کشم ۔۔۔ شیر پیشت آورم ای محتشم
در ترا بیماری آید بہ پیش ۔۔۔ من ترا غمخوار باشم ہمچو خویش
دستکت بوسم بمالم پایکت ۔۔۔ وقت خواب آید بروبم جاگکت
گر بہ بینم خانہ ات را من دوام ۔۔۔ روغن و شیرت بیارم صبح و شام
ہم پنیر و نانہائے روغنین ۔۔۔ خمرہا جغرا ها اے نازنین

ای ندای تو ہمہ بزہای من: ای بیادت ہی ہی ویہای من

حضرت کلیم اللہ نے اُس عاشق آشفتہ حال کے ظاہر کو خیال فرما کر راز حقیقت باطن پر توجہ نہ فرمائی۔ اور چونکہ عامل علم رسالت اور ناظم نظم ہدایت تھے آداب عبد و معبود سے خبردار کیا۔ اُس بیدار بخت کو ہوشیار کیا دیوانہ کوی محبت کو راہ فرزانگی دکھائی۔ حسب عادت تبلیغ وحدانیت فرمائی

گفت موسیٰ ہای خیرہ سر شدی خود مسلمان ناشدہ کافر شدی

این چہ ژاژ است و چہ کفرای نابکار پنبۂ اندر دہانِ خود فشار

چارق و پاتابہ لائق مر ترا است آفتابے را چنینہا کے سزا است

گر نہ بندی زین سخن تو حلق را آتشے آید بسوزد خلق را

گر ہمین دانی کہ یزدان داور ست ژاژ و گستاخی ترا چون باور ست

شیر اُو نوشد کہ در نشو و نما ست چارق او پوشد کہ او محتاج پا ست

دست و پا در حق ما آسائش است در حقِ پاکی حق آلائش است

لم یلد لم یولد اور الائق است والد و مولود را او خالق است

موسیٰ علیہ السلام نے اُس عاشقِ جمال احدیت و پروانۂ شمع ربوبیت کو سخت اور درشت الفاظ کے ساتھ جو تنبیہ فرمائی تو آپکی اس نصیحت سے اُس دلفگار کو دونی اذیت ہوئی۔ پیغمبر اولوالعزم کو دیکھ کر آبدیدہ اور خاموش ہوا اور صحرای پرخطر میں وہ فراق رسیدہ رہ پوش ہوا۔

گفت ای موسیٰ دہانم دوختی وز پشیمانی تو جانم سوختی

جامہ را بدرید و آہے کرد تفت سر نہاد اندر بیابان و برفت

ادھر یہ خستہ جان نادم اور پشیمان ہوا۔ اور اُس کی نیاز آمیز اور محبت خیز تقریر موقوف ہوئی۔ اودھر شاہد حقیقی نے اپنے عاشقِ جانباز و واقفِ راز کی یہ دلداری فرمائی۔

وحی آمد سوی موسی از خدا   بندۂ ما را ز من کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی   یا برای فصل کردن آمدی
تاتوانی پا منہ اندر فراق   البغض الا شیاء عندی الطلاق
ہر کسے را سیرتے بنہادہ ام   ہر کسے را اصطلاحے دادہ ام
درحقِ او مدح در حق تو ذم   درحق او شہد درحق تو سم
درحق او نور درحق تو نار   درحق او ورد درحق تو خار
درحقِ او نیک درحق تو بد   درحقِ او خوب درحق تو رد
ما بری از پاک و ناپاکی ہمہ   وز گران جانی و چالاکی ہمہ
من نکردم خلق تا سودی کنم   بلکہ تا بر بندگان جودی کنم
ہندیان را اصطلاح ہند مدح   سندیان را اصطلاح سند مدح
ما بروں را ننگریم و قال را   ما دروں را بنگریم و حال را
آتشے از عشق در جان برفروز   سر بسر فکر و عبارت را بسوز
موسیا آداب دانان دیگر اند   سوختہ جان در دانان دیگر اند
عاشقان را ہر نفس سوزیدنیست   بردہ ویران خراج و عشر نیست
گر خطا گوید ورا خاطی مگو   گر شود پر خون شہید او را مشو
خون شہیدان را از آب اولی تر است   دین خطا از صد ثواب اولی تر است

ملتِ عشق از ہمہ دینہا جداست | عاشقاں را مذہب و ملت خداست

غرض یہ عاشقان حضرتِ احدیت و پروانہ جمال شمع الوہیت عالم جوش اور حالت وجد میں جو کچھ فرماتے ہیں وہ یاد مطلوب حقیقی سے خالی نہیں ہوتا۔ اسی کو شغلِ روحی اور ذکر حالی کہتے ہیں۔ یہی ان کی ریاضت اور یہی انکی عبادت ہے اور یہی سچی محبت مقبول بارگاہ رب العزت ہے۔ ماسوا تصورِ مطلوب اور یادِ محبوب جملہ موجودات کو فراموش کرتے ہیں۔ اور اہل محبت کو ہمیشہ عین ذات سے سروکار ہوتا ہے۔

گو ذاتِ حضرت احدیت نسبت سے مبرا اور اضافت سے معرا ہے۔ کہ جواسیس تخیلات و اوہام۔ وطائرانِ عقول و افہام اسی مقام پر قاصر و مجبور ہیں۔ حقیقت ذات الوہیت اور کنہ اسرار احدیت سے آگاہی یقینی انسان کے احاطۂ ادراک و امکان سے باہر ہے۔

کنہ ذاتش رہ سوال بربست | عقل حیران و نطق لال نشست

جل من لا الہ الا ھو ۔ لا تقل کیف ھو لا ماھو

حق معرفت حضرتِ قدس قبیل محالات سے ہے۔ ہماری ہستی ضعیف اور محدود۔ اور ذاتِ واجب الوجود بی چون و بیچگون ہے "چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک" کا مضمون ہے۔ اگر اس بحر محیط سے آشنا اور خبردار ہوتے ہیں تو وہی دلفگار جو خودی کو مٹا کر اپنی ہستی سے ہاتھ دھوتے ہیں اور شوق وصال میں قطرہ وار اس قلزم ناپید اکنار میں نیست و نابود ہوتے ہیں۔ ورنہ کس کی مجال ہے کہ نظارۂ جمالِ حضرت ذوالجلال کا دم بھرے۔ اور

وصال شاہد یکتا و بے مثال کی آرزو کرے۔

اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

انہیں عاشقان صادق کا یہ جگر ہے کہ راہ محبت میں فراق کے رنج اور ہجرت کے صدمے سہتے ہیں اور صراط رضا و تسلیم پر ثابت قدم رہتے ہیں جملہ مرادات سے دست بردار اور کار دنیا سے بیکار ہو کر افکار عقبیٰ کو بھی خیرباد کہتے ہیں تب شاہد حقیقی کی فضائے قربت میں رہتے ہیں بقول مولانا

ہر کرا باشد زیز دان کار و بار
بار انجا یافت بیرون شد ز کار

غم کا غم نہ خوشی کی خوشی ہمیشہ عالم حیرت اور حالت بیخودی میں رہتے ہیں۔ نہ کسی کی عداوت سے غمگین نہ کسی کی عنایت پر تحسین جملہ معاملات اور واردات کا فاعل حقیقی خالق موجودات کو جانتے ہیں۔ مسئلہ جبر و قدر کے رموز و نکات سے بخوبی آگاہ ہوتے ہیں۔ اس لئے انسان کو کمزور اور مجبور مانتے ہیں۔ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا ؕ

اس اختلافی مسئلہ میں محققین کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض نے انسان کو قادر بعض نے مجبور اور بعض نے بین الجبر و الاختیار منظور کیا ہے۔ ہر فرقہ نے دلائل عقلی و نقلی سے اپنے قول کی تائید کی ہے۔ اور دوسرے گروہ نے بھی اپنے خیال کے موافق بکثرت استدلال پیش کئے ہیں اور مخاطب کے دعوے کی پوری تردید کی ہے۔ لیکن اکثر ہمارے حضرات صوفیہ کرام نے

یہ فرمایا ہے کہ انسان مجبور ہے بھی اور نہیں بھی ہے۔ اس لئے کہ جبر کی چار قسمیں ہیں۔ اوّل جبر جزئی۔ یعنی پہلے طالب راہ حق کو یہ جاننا چاہئے کہ نفس میں عارضی طور پر ایک قسم کی قوت اختیاری بھی ہے کہ امر و نہی رحمت و زحمت عتاب و عنایت کی فرمائش کرتا ہے۔ اور یہ مسلمہ ہے کہ حکم بغیر اختیار نہیں ہوتا گو حقیقت میں وہ مجبور ہے مگر اپنی مجبوری سے اسوقت آگاہ نہیں ہوتا ہے اسلئے حکم کرتا ہے۔ دوّم جبر تیقن یہ مرتبہ توحید صفات ہے۔ سوّم جبر تخلیس یہ مقام توحید افعال ہے۔ یہ مرتبہ جب سالک کو نصیب ہوتا ہے تو موحد خود اپنی مجبوری کو دیکھتا ہے۔ اور کامل یقین کے ساتھ جملہ واقعات و واردات کا فاعل حقیقی شاہد غیبی کو جانتا ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ شہید سرمد دہلویؒ کو جب غلبۂ جذبات نے محو تجلیات انوار ذات کیا اور بادۂ بیخودی سے مست و سرشار ہو کر لباس ظاہری سے بھی سبکبار ہوئے اور دیوانہ وار پھرنے اور ہمہ اوست کہنے لگے اُس وقت اورنگ زیب نے اعتماد خان پنجہزاری کو مامور کیا کہ سرمدؒ کو کپڑے پہننے پر مجبور کیا جائے مگر جب سرمدؒ نے قطعی انکار کیا تو حضرات علماء نے سرمدؒ کے قتل کا فتویٰ لکھا اور عالمگیر نے اسکو منظور کیا۔ اور جلاد مقتل میں جب آمادۂ قتل ہوا تو سرمدؒ نے برجستہ یہ مطلع پڑھا۔

سر جدا کرد از تنم شوخے کہ با ما یار بود
قصہ کوتہ کرد ورنہ درد سر بسیار بود

لیکن بظاہر تو قاتل سرمدؒ کا جلاد تھا۔ یا اورنگ زیب جسکے حکم سے جلاد آیا یا وہ علماء جنہوں نے قتل کا فتویٰ لکھا اُن کا نام بھی سرمدؒ نے نہیں لیا۔ اور کہا تو

یہ کہاکہ "شوخے کہ با ما یار بود"۔ لہذا وجہ اس کی یہی تھی کہ سرمد علیہ الرحمۃ کو اپنے قائلِ حقیقی سے سروکار تھا اسلیئے اُسی کی جانب اشارہ کیا اور یہی توحید افعالی کی شان ہے کہ موحد تمامی موجودات کو مجبور اور بے قصور اور شاہد غیبی کو قادر اور فاعل حقیقی جانتا ہے۔ چہارم جبر تحقیق۔ اس کو جبر کلی بھی کہتے ہیں یہ مرتبہ عاشقین کو بعد الفنا مقام بقا میں حاصل ہوتا ہے۔ اُس وقت جبر و جابر و مجبور میں فرق نہیں رہتا۔ اور اُس کو پھر اختیار کامل ہوتا ہے۔

اور حقیقت میں جبر ضمیمہ ہے رضا کا۔ اور رضا ایک مرتبہ علیا کا نام ہے جو عشاق عالی درجات کا مقام ہے۔ اور رضا ترک تدبیر اور انتہائی تسلیم امر حق کو کہتے ہیں۔ اور تسلیم کے اصطلاحی معنی کمالِ قیام و ثبات اور استقلال کے ساتھ راضی رہنا حق و غیر حق سے برضائے حق۔ اور رضا ثمرہ ہے محبت کا عاشق متمکن مقام رضا دغدغۂ حسد سے محفوظ ہوتا ہے۔ اور اُس کا یقین کامل ہوتا ہے کہ تقسیم جناب احدیت جل علیٰ غلط نہیں ہے۔ اور جو کچھ عالم ناسوت میں اس کو پہونچتا ہے بغیر کسی اعتراض کے رضائے حق کا خیال کرتا ہے اور اسی وجہ سے عشاق استدعا۔ دفع قضا نہیں فرماتے کہ دعا منافی شان رضا ہے چنانچہ مولانا قدس سرہٗ نے اقسام حضرات اولیا میں ایک گروہ کی نسبت لکھا ہے کہ وہ دعا نہیں فرماتے۔ یہ اہل گروہ وہی آوارۂ دشتِ محبت ہیں جو ہمیشہ میدانِ رضا و تسلیم میں شاہد غیبی اور مطلوب حقیقی کے سامنے سرنگون رہتے ہیں چنانچہ آپ فرماتے ہیں

قوم دیگر می شناسم ز اولیا | کہ زبان شان بستہ باشد از دعا

از رضا کہ ہست ام آن کرام — جُستن در فع قضاشان شد حرام
در قضا ذوقے ہمی بینند خاص — کفرشان آید طلب کرد ان خلاص
ہر چہ می آید برون از ملک غیب — خاص خود دانند آن بی شک در یب

الغرض عاشقانِ جانباز وطالبان شاہد بے نیاز کے مدارج علیا اور مراتب ممتاز کا ذکر بھی ہمارے فہم وخیال کے لحاظ سے ناممکن بلکہ محال ہے. یہ حضرات شوقِ دیدار یار میں ایسے مستغرق اور محو ہوتے ہیں اور جملہ تعلقات موجودات کو سہو فرما کر بحرِ فنا میں اپنی ہستی کو ڈبوتے ہیں کہ ان کو مرتبہ بقائے کامل کا حاصل ہوتا ہے **بقول حافظ شیرازرح**

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

عشق ہی وہ مشرب ہے کہ جسمیں قاعدہ اور ضابطہ کا انتظام نہیں عشق ہی وہ سودا ہے جس میں سوائے نفع کے نقصان کا نام نہیں. عشق ہی وہ زینہ ہے جو بام مقصود تک پہونچاتا ہے اور انسان کو قدرت الٰہی کا تماشا دکھاتا ہے۔

حقیقت عشق کی نسبت ارباب محققین کے اقوال متعدد ہیں۔ اور بظاہر کسی قدر اختلاف بھی ہے. لیکن یہ اختلاف نہ بوجہ نفسانیت ہے بلکہ بجہت حقانیت کے ہے کیونکہ عشق اسرار الٰہی ہے۔ اس لیے عشق کی حقیقت دریافت کرنا اول تو احاطۂ ادراک بشری سے باہر ہے دوم فیضان باطنی کی بھی ایک صورت اور ایک شان نئی ہوتی ہے لہذا ان حضرات نے عشق کے معنی اور مدارج اپنے اپنے حال اور دریافت اور استعداد کے لحاظ سے تحریر فرمائے ہیں۔

چنانچہ اہل لغت عشق کے معنی یا یوں کہیئے کہ عشق کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ عشق عشقہ سے ماخوذ ہے اور عشقہ ایک گھانس کا نام ہے جس کو ہندی میں امربیل کہتے ہیں۔ بظاہر اس گھانس کی جڑ نہیں ہوتی ہے مگر اس عجیب الخلقت گھانس میں یہ قوت ہے کہ اس کی ایک شاخ جس درخت پر ڈال دی جائے تو اس قدر جلد اُس کے نشو نما میں ترقی ہوتی ہے کہ تھوڑے عرصہ میں اُس درخت کو یہ چھپالیتی ہے۔ اور اس بغیر بیج وبُن کی گھانس میں یہ بھی اثر ہے کہ خود تو سرسبز رہتی ہے لیکن اپنے زیر سایہ نخل کو اس کی شدت حرارت خشک اور اس کی ہستی کو نیست ونابود کر دیتی ہے۔ علیٰ ہذا شگوفہ عشق کا بھی یہی فیض ہے کہ جب اس بے صورت اور بے نشان نخل باغ قدرت کا سایہ مزرعۂ قلب انسان پر پڑتا ہے تو مراتب اور مدارج میں گو بہت جلد اور غیر معمولی ترقی ہوتی ہے۔ مگر اثر عشق خودی کو مٹاتا ہے اور نخل ہستی کو جلاتا ہے اور انسان کو مقام فنا کے کامل میں پہونچاتا ہے جو دیار قرب شاہد حقیقی کی آخری منزل ہے بقول حضرت ملک محمد جائسی علیہ الرحمتہ

پریت بیل جن اورجھ کوئی — اُورجھا ہوا نہ چھوٹے سوئی

پریت اکیل بیل جن چھاوا — دوسر بیل نہ بسرے پاوا

اور حکما کی تحقیق یہ ہے کہ عشق مالیخولیا کی قسموں سے ہے۔ اور بعض کا مقولہ ہے کہ مخاطب کی قوت ارادیہ جب غالب ہوتی ہے تو مغلوب اپنی قلب کی کمزوری کے باعث غالب کا مطیع ہوتا ہے اور اصطلاح میں اسکو عشق کہتے ہیں

علماء شریعت اَلْعِشْقُ نَارٌ تُحْرِقُ مَاسِوَی الْمَحْبُوْبِ فرماتے ہیں
یہ ارشاد ایسا جامع اور وسیع المعنی ہے کہ یہی ایک جملہ ہر مذاق و مشرب کیواسطے
کافی دلیل ہے
ہمارے حضرات صوفیہ کرام نے عشق کو سرمایۂ ناز و اعزاز فرمایا ہے۔
بعض کا ارشاد ہے کہ عشق تقرب الٰہی میں اُس مقام کا نام ہے جو غایت
رفعت عارفین ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ عشق اسماء حسنٰی جناب باری جل جلالہٗ
میں ہے۔ بعض عارفین نے فرمایا ہے کہ عشق حضرت بے نیاز کا ایک راز ہے
اور بجز آدم و اولاد آدم اور کسی مخلوق کو اسکا علم نہیں تفویض ہوا۔
بعض کی تحقیق یہ ہے کہ عشق اُس نخل بہشتی کا نام ہے جس کے پاس جانیکی
آدم کو ممانعت تھی کہ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ۔ بعض نے فرمایا ہے کہ
بروز عہد الست جنکو تجلی انوار غیبی کا مشاہدہ ہوا اور جنہوں نے نظارۂ جمال شاہد مطلق
سے مسرور ہو کر اقرار الوہیت جل جلالہٗ کیا۔ یہ حضرات عالم ارواح میں لذت
دید سے بیخود رہتے ہیں اور جب عالم ناسوت میں آتے ہیں تو شوق وصال
مطلوب کا جوش ہوتا ہے۔ انہیں ازلی اہل دید کو عشاق اور ان کے جوش
باطنی کو عشق کہتے ہیں۔ اور بعض کا ارشاد ہے کہ عشق ایک قوت روحی کا نام
ہے۔ اور حضرتِ مولانا فرماتے ہیں کہ ؎ "عشق امیر المومنین حیدر بود"
اسی طرح تعیین اقسام عشق میں بھی متعدد اقوال ہیں۔ لیکن عشق کی یہ
دو قسمیں بہت مشہور ہیں۔ مجازی۔ اور حقیقی۔ اور یہی دو نوں قسمیں جامع ہیں
جملہ اقسام کی۔ اور محققین کا قول ہے کہ پاکبازان عشق کا میلان طبیعت جانب

حُسن مجازی بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوتا۔ کیونکہ حسین مظہر انوار غیبی ہیں اور حُسن اُن کا بحر جمالِ حقیقی کا قطرہ ہے۔ اس لئے طالب راہ عشق حقیقی کو کوچہ عشق مجازی میں مفید اور ضروری سبق حاصل ہوتے ہیں مثلاً محبت وجفا۔ درد وبلا جو لوازمات عشق ہیں رفتہ رفتہ طبیعت اُن کی عادی اور متحمل ہو جاتی ہے بقول غازی بدستِ پوریا شمشیر چوبین میدہد

تا او از دُو دستا شود شمشیر گیرد در غزا

لہٰذا شاہدانِ مجازی کی دید اسی صورت سے مفید ہے کہ توجہ جانبِ معشوق حقیقی رہے۔ اور اُس کے حُسن لازوال کا مضبوط اور پختہ خیال ہو۔ چنانچہ مولانا علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔

صورتش پیداست این سر رحیست	عاشقا واجو کہ معشوق تو کیست
پرتو خورشید بر دیوار تافت	تابش عاریتی دیوار یافت
پر تو خورشید شد آن جائیگاہ	ماند ہر دیوار تاریک وسیاہ
عاشقے رو شاہد خوبی بجو	صیدِ مرغابی ہمی کُن جو بجو
عشق بر مردہ نہ باشد پایدار	عشق را بر حیٔ بر قیوم دار
نور رادمی بین تو در ہر روشنی	گو نتاد آن نور در ہر روزنی

اور رفعت عشق میں جملہ محققین کا اتفاق ہے کہ قرب الٰہی میں یہ خاص مقام ہے۔ عشاق بعد تجرید وتخلیص ماسوا ازمعشوق حقیقی جب منازل فنائے کامل طے فرماتے ہیں تو ذاتِ حضرت واجب الوجود سے واصل ہوتے ہیں اور مرتبہ عینیت کا اُن کو حاصل ہوتا ہے

عاشقان اندر عدم خیمہ زدند
چون عدم یکرنگ نفس واحد ند

الغرض عشق کا اعزاز۔ اور وقارِ عاشقان پاکباز غیر محدود ہے ہمارا فہم وادراک کنہ حقیقت عشق دریافت کرنے میں ضرور قاصر اور مجبور ہے کیونکہ عشق بھی اسرارِ حضرت رب غفور ہے ع "عشق اصطرلاب اسرار خداست"

میرا خیال ہے کہ عشق کی عظمت اور عاشقان صادق کی شان و رفعت ایسی واضح ہے جس کے لئے تشریح اور تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔ بلکہ یہی ایک دلیل کافی اور بس ہے کہ حضراتِ اہل تصوف اس راہ طریقت میں خاص ایک سلسلہ کے پابند ہوتے ہیں یعنی کوئی قادری ہے کوئی چشتی کوئی نقشبندی پھر ہر سلسلہ کی شاخیں ہیں۔ اور ہر سلسلہ کے طرز تعلیم میں تفاوت۔ اِن وجوہات سے باہمی مذاق اور خیالات میں بین فرق ہے۔ اور انہیں بزرگان دین کے بہ لحاظ مدارجِ باطن گو متعدد خطاب اور بھی ہوں گے لیکن بہ مناسبت مراتب ظاہری چند لقب مشہور یہ ہیں۔ صوفی۔ صافی۔ سالک۔ مجذوب شیخ۔ ولی ابن الوقت۔ ابوالوقت۔ مخدوم۔ غوث۔ قطب۔ قطب مدار۔ قلندر۔ ابدال۔ اوتاد۔ فقیر۔ اور اِن حضرات عالی منزلت کے طریق و مشرب میں کافی اختلاف بھی ہے۔ لیکن اصول جملہ ہادیانِ راہ طریقت کا صرف خدا طلبی ہے۔ اور سب کا طریق طلب عشق و محبت پر محمول ہے۔ گو اِن حضرات کے دیگر عادات اور خیالات جداگانہ ہیں۔ مگر ہر طریق اور ہر مشرب میں آخری کلیہ یہی ہے کہ عشق لازمی اور ضروری ہے۔ بلکہ ہر مذہب کا مدار عشق پر ہے۔ اور ہر ملت کی

جان عشق ہے۔ مصرع: "سچ ہے بے عشق کچھ نہیں ہوتا" لہذا عشق ہر فرد انسان کے لئے تقویت ایمان ہے۔ اور سوائے فائدہ کے اس میں نقصان کا نام نہیں۔ دوہا۔

پریم برابر جوا نہیں کبھی نہ جس میں ہار
داؤں پڑے تو لین گسائیں ہرے بڑا یار

علیٰ ہذا انہیں مقبولانِ بارگاہ صمدیت و واصلانِ حضرت احدیت میں جو عنایت وہبی سے خوشحال اور دولت ازلی سے مالا مال ہوتے ہیں ایک گروہ سرمست و مدہوش جام بادۂ بے خودی نوش فرما کر شمع جلال ایزدی پر شیفتہ اور سطوت فردانیت خداوندی پر فریفتہ ہوتا ہے۔

یہی آوارۂ دشت تجرید آشنائی بحر تفرید۔ صاحب کیف وحال۔ ثابت قدم و پختہ خیال۔ مجرد و آزاد۔ خانماں برباد۔ تصدیقِ وحدانیت معبود میں اپنی ہستی نیست و نابود کرتے ہیں۔ تعلقات موجودات کا التفات مٹا کر وادی طلبِ وصال میں قدم دھرتے ہیں۔ اور شوقِ دیدار جمال میں زبانِ حال سے عرض کرتے ہیں۔

نہ بناءِ خلق باشم نے از کسے ہراسم
مرغ کشادہ بالم ترس قفس ندارم

یہ مردِ میدان تفرید صحرای توحید میں رہتے ہیں۔ اصطلاحات صوفیہ میں ان کو قلندر کہتے ہیں۔ ان کا رندانہ مشرب ملامتی مذہب ہے۔ موحد خطاب حیدری لقب ہے۔ یہ اہل یقین تارک دنیا و دین ہوتے ہیں۔ اور انکا قول ہوتا ہے۔

خود را بجذ اگذار و بگذر ز ہمہ
کین خواہش جملہ دین دنیا ہمیچ

تحقیقات رموزِ صفات وشہود میں کامل اسرارِ مسئلہ توحیدِ وجود واجب الوجود کے حامل۔ صبر میں کمال۔ جبر میں استقلال۔ استغراق و محویت کا جوش۔ سُکر بادۂ الست سے مدہوش۔ عقل و خرد سے دست بردار۔ دوئی سے دُور۔ خودی سے بیزار۔ نہ کسی کے مرید نہ کسی کے پیر۔ عین ذات سے سروکار۔ موحد فقیر۔ جویای کنہہ حقیقت۔ غریق بحر معرفت۔ یار و اغیار سب کے دوست محققِ اسرار او ست واز وست بلکہ ہمہ اوست۔ صاحب جوش۔ محو تجلیات انوار۔ بار ہستی سے سبکدوش شاہدِ فنا سے ہمکنار مرتبہ بقای کامل کا حاصل ذات حَیٌّ وَّلَا یَمُوْتُ سے واصل۔ انہیں نصیب نظارۂ جمالِ حضرتِ بیچون و بیچگون ہے ع "من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی" کا مضمون ہے۔

یہ ملامتی کوچہ اور قلندری راہ ہے۔ زاہدِ سردِ مہر اس سرِ درد کیفیت سے کب آگاہ ہے۔ جرعہ کشان بادۂ محبت درِ پیر معغان کی خاک چھانتے ہیں۔ اس بیخودی کی قدر سالکانِ خمخانہ وحدت جانتے ہیں۔

قدر گل و مل بادہ پرستان دانند	نے تنگدلان و تنگدستان دانند
از بے خردی بے خردان معذورند	ذوقیست درین بادہ کہ مستان دانند

طریق قلندری اس کوچۂ فقر میں نہایت سخت اور دشوار گذار راہ ہے ما و شما کلمنہ نہیں کہ مذاق قلندری کا دعویٰ کریں۔ اور ان مردانِ خدا سے

ہمسری کا دم بھریں۔ قلندر جب کوچۂ طلب میں قدم دھرتا ہے تو پہلا کام یہ ہے کہ خیال دنیا و مافیہا کو ترک کرتا ہے۔ چنانچہ یہ چار ترک جو مشہور اور معروف ہیں کہ "ترکِ دنیا ترک عقبیٰ ترک مولا ترکِ ترک" قلندر کے واسطے ان چار ترک کا بہ ترتیب تارک ہونا لازمی ہے۔ اور یہ چار ترک جنکا ذکر بہت مختصر الفاظ میں ہوگیا۔ لیکن ان کی پوری تشریح کے واسطے ایک مطول عبارت درکار ہے۔

صرف ترک اول یعنی ترک دنیا کی نسبت محققین کا یہ قول ہے کہ یہ ایک ترک دس ترک پر منقسم ہے۔ یعنی اس ایک ترک دنیا کے دس جزو ہیں اور ہر جزو کے ساتھ ایک طلب ہے۔ جن کی تفصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ جزو اول ترک دنیا اُس کے ساتھ طلب آخرت۔ جزو دوم ترک ہوائی نفس و طلب صفائی دل۔ جزو سوم ترک صحبت ناجنس و طلب خلوت۔ جزو چہارم ترکِ سخن لایعنی و طلب معارف ربانی۔ جزو پنجم ترک خواب غفلت و طلب بیداری ظاہر و باطن۔ جزو ششم ترکِ لذائذ جسمانی و طلب غذای روحانی۔ جزو ہفتم ترک عیش و راحت و طلب محنت و بلیت۔ جزو ہشتم ترک تقلید و طلب تحقیق جزو نہم ترک ناز طلب نیاز۔ جزو دہم ترک شہرت و طلب زاویہ خمول و عزلت تاریک دنیا طالب راحق ہوتا ہے۔ بغیر طلب صادق دنیا کو ترک کرنا محال ہے۔ یہ سالکین برگزیدہ کا مقام ہے۔ چنانچہ اکثر ارباب طریقت نے اسی ترکِ اول یعنی ترک دنیا کی تعمیل کو طالب راہ خدا کیواسطے کافی سمجھا ہے اسلیئے کہ خواہش نفسانی و لذائذ جسمانی میں مبتلا کرنے کے واسطے دنیا ایک بڑا دام ہے۔

اور اسی بلسو اکا مکآرہ اور سجن المومنین نام ہے۔

طالب دنیا رنجور اور خدا سے دور رہتا ہے۔ اور تارک دنیا کو خدا ضرور ملتا ہے اور وہ مسرور رہتا ہے۔ طالب خدا کو تارک دنیا ہونا لازمی ہے ورنہ منزل مقصود تک پہونچنا دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ بقول مولانا علیہ الرحمتہ۔

ہم خدا خواہی وہم دنیائے دون
این خیال است ومحال است جنون

لیکن کوچۂ قلندری میں ترک دُنیا بہت چھوٹا اور ابتدائی کام ہے کیونکہ مراحل ترک عقبیٰ اور منازل ترک مولا کے بعد وہ مقام ہے کہ طالب مراتب علیا سے ممتاز اور خطاب قلندری سے سرفراز ہوتا ہے۔ بلکہ کمال قلندری کا تمغہ ترک چہارم کے بعد بارگاہ احدیت سے مرحمت ہوتا ہے۔

علیٰ ہذا ترک دویم یعنی ترک عقبیٰ کے بیش جزو ہیں اور ہر جزو کے ساتھ ایک مراد ہے۔ اور تارک ترک دویم موحد اور آزاد خیال صاحب کیف وحال ہوتا ہے۔ اور سبب ترک عقبیٰ جوش محبتِ ایزدی ہے کہ طالب آرام دُنیا اور انجام عقبیٰ سے بے غرض اور بے خبر ہو جاتا ہے۔ ترکِ دنیا سے ترک عقبیٰ کا مرتبہ بڑا ہے مگر سختی اور دشواری بھی بے انتہا ہے۔ بغیر تجرید کامل مرتبہ ترک عقبیٰ کا حاصل نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے بعض سالکین نے طالب کے واسطے راہ طریقت میں یہی دو ترک یعنی ترکِ دنیا اور ترکِ عقبیٰ کو اختیار فرمایا ہے کہ انسان کے علوی مرتبت کا اسی ترک اول اور ترک ثانی پہ

مدار ہے۔ بقول

مامقیمانِ کوئے دلداریم +
رُخ بدنیا و دین نمی آریم +

جوشِ محبت مطلوبِ حقیقی بنیاد خواہشات و مرادات کو مسمار اور طالب صادق کو دام تعلقات سے آزاد اور کونین سے بے سروکار کرتا ہے عاشق جانباز تصور روئے محبوب میں ایک موئی مطلوب پر دین و دنیا نثار کرتا ہے بقول حافظ شیراز کہ ع "بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را"، حالت وجد و کیف میں ترک دنیا کے بعد ترک عقبیٰ کا خیال ہوتا ہے۔ شوق وصال میں گویا زبان حال سے کہتا ہے رباعی

آنکس کہ ترا شناخت جانرا چہ کند | فرزند و عیال و خانمان را چہ کند
دیوانہ کنی ہر دو جہانش بخشی | دیوانۂ تو ہر دو جہانرا چہ کند

اپنی وسعت حوصلہ کے لحاظ سے ترک دنیا اور ترک عقبیٰ کو سرمایۂ وصال شاہد حقیقی جانتا ہے۔ جوشِ عشق اور جذب قلندری کے آگے کونین کو بازیچۂ اطفال خیال کرتا ہے۔ شعر

ہر دو عالم قیمت خود گفتۂ
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

اسیطرح ترک سویم کے تلیث جزو ہیں۔ تارک اس کا صاحب جوش اور بادۂ توحید سے مدہوش ہوتا ہے۔ اور بسببِ ترک سویم یعنی ترک مولیٰ کمال توحید ہے۔ موحد کو مقام توحید میں جب عروج کامل ہوتا ہے تو مرتبۂ اتحاد کا حاصل

ہوتا ہے۔ توحید کے معنی ایک دیکھنا ہیں۔ اور اتحاد کے معنی ایک ہونا ہیں
۔توحید کے واسطے فرمان حضرتِ رب العزت لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھاً اٰخرا
آیا ہے۔ اور اتحاد کیواسطے اُس صاحب شان فردانیت مالک عزت وحدانیت
نے لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھاً اٰخرا فرمایا ہے۔ موحد کے خیال میں جب
صورت یگانگی نقش پذیر ہوتی ہے تو قید حجاب تعینات سے آزاد ہوتی ہے
اور انوار تجلیات اتحادی کا ظہور ہوتا ہے۔ باوجود کثرت تعداد
طالب کو افراد موجوداتِ عالم میں ماسوا ءشانِ شاہد یکتا کچھ نظر نہیں آتا۔ ذکر فکر
شہود۔ وجود۔ سیر۔ سلوک۔ قدم۔ عدم۔ نا۔ شما۔ عذاب۔ ثواب
رنج۔ راحت۔ ذلت۔ عزت۔ ہست۔ بود کا امتیاز مفقود ہوتا ہے جہاں
غیر کی بو ہو نہ دوئی کی گفتگو وہاں نہ محب ہے نہ محبوب۔ نہ طالب ہے نہ مطلوب
نہ خدا ہے نہ بندہ۔ پھر ایسے مقام پر عبدیت اور مولائیت کی گنجائش کہاں
اقرار وانکار دونوں منافی نشان اتحاد ہیں۔ کیونکہ مشہور ہے کہ " اثبات
التوحید فساد فی التوحید"

اور ترک چہارم یعنی ترکِ ترک کے چالیس جزو ہیں۔ اور بلحاظ مدارج
ترک ثانی ترک اول سے اور ترکِ ثالث ترک ثانی سے سخت اور دشوار ہے
جن کی پوری تشریح بخوف طوالت نہیں کی۔

حقیقت یہ ہے کہ طریق قلندری کار مرداں ہے نہ سہل و آسان یہی
جرار طبیعت اور شیر طینت توحید کے صحرائے ویران اور سنسان اور
ہُو کے چٹیل میدان میں رہتے ہیں ع زبانسے اُف نہیں کرتے نہ دلکا حال کہتے ہیں"

خصوصاً یہ چوتھا درجہ ترکِ ترک کا یعنی ترک کو بھی بھول جانا نہایت اہم اور دشوار کام ہے۔ یہ حضرات تجلیات انوار احدیت اور نظارۂ دیدار الوہیت میں ایسا محو ہوتے ہیں کہ ہستی ذات احدیت میں فنا ہو کر اپنی فنا کو بھی بھول جاتے ہیں۔ یہی غایت فنا ہے۔ کیونکہ حضرات عارفین نے فنا کی جو صفت بیان فرمائی ہے خلاصہ اُس کا یہ ہے کہ فنا سے۔ مراد عدم شعور ہے واسطے حصول اظہار ہستی واجب الوجود۔ اور اگر اس بے شعوری کا بھی شعور صاحبِ فنا کو نہ ہو تو اُس کو عرف صوفیہ میں فناء الفنا کہتے ہیں۔ بقول

تو ز تو گم شو کہ تفرید این بود	گم شدن گم کن کہ تجرید این بود
تو مباش اصلاً کمال این است و بس	تو ز تو گم شو وصال این ست و بس

اس لئے کہ فانی کو اپنی فنا کا شعور دشہود منافی شان فنائی اکمل ہے یہ مقام قلندران مخصوصین کا ہے کہ عالم محویت میں اپنی ہستی کا ہوش نہ فنائے ہستی کی خبر۔ نہ دلیل اثبات۔ نہ سبیل نفی۔ راہ حق میں نیست اور نابود۔ معدوم و مفقود ہونا یہی ان کا غائت کمال ہے۔

مزید براں قلندر کی حالت بھی متضاد ہوتی ہے۔ یہ مردانِ خدا صاحب فیض بھی ہوتے ہیں اور انتہا کے بے فیض بھی۔ جلالی شان۔ جمالی آن بان عاشقانہ نیاز۔ معشوقانہ انداز۔ وقتِ سلوک عاقل و ہوشیار حالتِ جذب میں مدہوش و سرشار۔ مقام صبر میں ساکت اور شوق وصال میں بیتاب بھی جوش حیرت میں خاموش اور مقرر و حاضر جواب بھی۔ نہ آرام کا خیال تکلیف کا ملال۔ نہ عزت کی حسرت۔ نہ ذلت کا اندیشہ قلندری چال ملامتی پیشہ بر باد کمین

فرد۔ آزادی میں طاق ۔ خوش گلو کے دوست خوش رد کے مشتاق

یعنی قلندر کو سماع سے رغبت اور حُسن پرستی کی عادت ہوتی ہے اسلیئے کہ خوش گلوئی اور خوش روئی میں صانعِ قدرت نے ایک خاص طور کی کشش اور جذباتی قوت مرحمت فرمائی ہے جو انسان کو اس کے خیال کے موافق رجوع اور متوجہ کرلیتی ہے۔

چنانچہ بعض اصحاب رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ کہ حضرت رب العالمین نے اکثر انبیاء مرسلین کو خوش الحان اور حسین مخلوق فرمایا اسواسطے کہ اُن کے وجود اطہر سے ہدایت خلق مقصود تھی پس علاوہ قوتِ روحانی کے بہ مناسبت فطرت انسانی صورتاً بھی شکیل بنایا اور صوتِ جمیل سے ممتاز فرمایا کہ افرادِ بنی آدم کو رجوع کرنے میں زیادہ آسانی ہو۔

اسی لحاظ سے ہمارے مخدومان چشت فرماتے ہیں کہ سماع آرام دلِ عاشقان ۔سرور سینۂ صادقان ۔غذائے جان سائران ۔ دوائی دردِ سالکان ہے۔

بعض عارفین کا ارشاد ہے کہ سماع معین وجدِ عارف اور سبب جمیعت حالِ سالک ہے۔اسواسطے کہ انسان کی ہیکل جسمانی میں چار قوتیں ہیں نفس دہوا دعقل و روح۔اور ہر ایک قوت کی علیحدہ ایک غذا ہے۔اور ہر ایک قوت کی غذا غذائے قوت ثانی کی ضد ہے۔یعنی غذای نفس سے نہ ہوا کو آرام نہ غذائی ہوا سے نفس کو رغبت ہے۔نہ غذائی روح سے عقل مسرور۔اور غذائی عقل سے روح کو نفرت ہے۔

اور یہ بھی اظہارِ وسعتِ قدرتِ معبود ہے کہ موجوداتِ عالم میں کوئی ایسی چیز نہیں کہ انسان کے حواس خمسہ میں آئے اور وہ غذائی قوائی مذکورہ نہ ہو۔ مثلاً آنکھوں کی دید۔ کانوں کی شنید۔ خوشبو کا امتیاز۔ زبان کا ذائقہ انگلیوں کا ادراک اور اندازہ یہ جملہ غذائی نفس و ہوا و عقل و روح ہے۔ لیکن جب ایک قوت کو غذا پہونچتی ہے تو بے اختیار دوسری قوتوں میں انتشار پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ غذا اُن کی طبیعت کے خلاف اور اُن کی خاص غذا کی ضد ہوتی ہے اور وجود جسمانی میں آثارِ پریشانی کا اظہار ہوتا ہے۔ اسواسطے سالک کے لئے ایک غذا ایسی درکار ہے کہ جو ہر چہار قوت کی جمیعت اور تقویت کا باعث ہو۔ اور اُسی ایک غذائے کامل الاثر سے ہر ایک قوت اپنی اپنی غذا حاصل کرے۔ اور ضد باہمی اور خصومت درمیانی بہ آسانی منقطع ہو جائے۔

لہٰذا یہ مجموعی صفت صرف لحن خوشگوار میں ہے۔ کہ آواز دل آویز ہر چہار قوت کو محفوظ کرتی ہے۔ یعنی نفس کو بآشتی صورتِ کجی سے راستی حاصل ہوتی ہے اور اور ہوا جانبِ استقامت مائل ہوتی ہے۔ عقل کو اصل معنی سے شادمانی ہوتی ہے اور روح کو سوئے عالم ارواح التفات ہوتا ہے۔

غرض ایک سماع سے باوجود اختلافِ طبایع چاروں قوتوں کو موافق اُنکی عادت کے غذا پہونچتی ہے اور انتظام عالم جسد میں جمیعت ہوتی ہے۔

حضرات صوفیہ کرام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ سماع کے تین مراتب ہیں۔ اول سماع عام جو محض برائے نفس ہوتا ہے وہ چار نوع پر منقسم ہے۔ طبیعی و ہوائی و شہوانی۔ و بدعتی۔ یہ قطعی حرام ہے۔ دوم سماع خاص جسکو بگوشِ عقل سنتے ہیں۔

اس کی تین قسمیں ہیں۔ رجائی دخوانی وعلمی یہ ہر سہ نوع پسندیدہ ہیں۔
سوم سماع اخص جسکا تعلق روح سے ہے یہ سماع باعثِ جوشِ کیف و
ذوق وجدانی اور سبب ترقی جذبات روحانی ہوتاہے یہی سماع حق ہے
اور اسی کو اہل حق سنتے ہیں۔
مختصر یہ کہ سماع سے روح کو کافی اہتزاز ہوتاہے۔ اور طالب کو سوئی
مطلوب رجوع اور متوجہ کرتاہے۔ چنانچہ کسی صاحبِ حال کا قول ہے۔

دل وقتِ سماع بوئے دلدار برد — جان را بہ سرا پردۂ اسرار برد
زین زمزمہ مرکبے است مر روح ترا — بردارد و خوش بعالم یار برد

علیٰ ہذا حُسن بھی تحریک خاص کا باعث ہوتا ہے اور مثل مسئلہ عشق حقیقت
حُسن کے بارہ میں بھی محققین نے اختلاف فرمایا ہے۔
بعض حکما کا خیال ہے کہ حُسن کو ملکی، رواج اور مذاق سے زیادہ مناسبت
ہے جس ملک میں جو صورت خاص یا مجموعی چند اشخاص نے پسند کی۔ رفتہ
رفتہ اُس کی شہرت ہوئی اور ایک زمانہ کے بعد عام طور سے اُسی جانب میلانِ طبیعت
ہونے لگتا ہے اور اُسی وضع اور ہیت کا نام حُسن ہو جاتا ہے۔
بعض کا مقولہ ہے کہ حُسن بذاتِ خود کوئی چیز نہیں بلکہ حُسن ایک حالت
قلبی کا نام ہے۔ فطرت نے رجوع اور متوجہ ہونے کے لئے قلب انسان کو
دو قوتیں دی ہیں۔ ایک عام جو ضرورت اور غرض کے ساتھ ہوتی ہے۔ دوسری
قوت خاص ہے جسکا اظہار اتفاقیہ ہوتا ہے۔ یعنی قلب کسی شخص کی جانب
عجز و نیاز کے ساتھ جب متوجہ ہوتاہے۔ اور حصول صلہ اور معاوضہ سے

ہمیشہ کے لئے بے غرض اور مستغنی ہوتا ہے اور اس خلوص اور نیازمندی کا اثر حیرت اور محویت کی شان پیدا کرتا ہے۔ تو اسی حالت کا نام محبت ہے اور شخص منظور کو محبوب اور اُس کی ہیت کو حُسن کہتے ہیں۔ اس لئے حُسن ایک شئے فرضی کا نام ہے جو درحقیقت قلب انسان کی ایک قوت ہے۔

اور حُسن کو رنگ و لباس و وضع سے بھی تعلق نہیں۔ اگر صورت معینہ اور صفات مقررہ کی قید ہوتی تو حُسن کسی ملک یا کسی خاص شہر کے لئے محدود ہوتا۔ اور دوسرے مقام کے باشندے دیدار حُسن سے اپنے مقام پر محروم رہتے مثلاً اگر صباحت کو حُسن قرار دیا جائے تو افریقہ کے لوگ پیرایۂ حُسن سے قطعی عاری ہوں گے۔

قطع نظر اس کے یہ بھی ہوتا ہے کہ شئ غیر محسوس کے ساتھ بھی محبت ہوجاتی ہے مثلاً بعض آواز پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ آواز رنگ و صورت سے قطعی اور صریح مبرا ہے پھر انسان آواز پر شیفتہ کیوں ہوتا ہے۔ اِسکی وجہ یہی ہے کہ کسی خوش الحان کی جانب اگر قلبِ انسان بہ کمال استقلال و نیازمندی متوجہ ہوتا ہے تو اسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ آواز کے ساتھ محبت ہوجاتی ہے۔ گو آواز غیر محسوس ہے اور بے صورتی کی شان رکھتی ہے۔ اسی جہت سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ حُسن قلبِ انسان کی ایک قوت کا نام ہے۔

لیکن اس سے زیادہ معتبر یہ رائے ہے کہ صانع مطلق نے افراد بنی آدم میں جس طرح صورتاً ایک کو دوسرے سے فرق بین کے ساتھ پیدا کیا ہے اُسی طرح مذاق و میلان طبیعت کا انداز بھی ہر فرد انسان کا جدا گانہ ہے۔ پس

خالق برحق کی پیدا کردہ مخلوق میں نہ کوئی صورت مہمل نہ کوئی مذاق فضول ہے ہر صورت کے واسطے ایک مذاق اور ہر مذاق کے واسطے ایک صورت معین اور مقرر ہے۔ اس لیئے کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حُسن انسان کے مذاق پر موقوف ہے۔

لیکن چونکہ اس موقع پر ذکر قلندرانِ ذی وقار خاصانِ روزگار کا ہے اسیلئے خیال یہ ہوتا ہے کہ انکا مذاق بھی خاص ہوگا نہ عام۔ لہٰذا یہ سوال کر سکتے ہیں کہ یہ صاحب ایمان و ایقان کس صورت اور کس شان کے مشتاق ہوتے ہیں اور کیا ان کا مذاق ہوتا ہے اور کس ہیت کو یہ حُسن کہتے ہیں۔

اس کی تصریح کم سے کم میرے امکان سے ضرور بعید ہے۔ کیونکہ مجھ جیسا نابلد کا خیال اور تشریح حُسن و جمال جسمیں مظہر صفت جمال اللہ ہیں اور حُسن پر تو انوار الٰہی ہے۔ اس لیے حقیقت حُسن کماحقہ سمجھنا کام اہل درد و محبت کا ہے۔ صاحبانِ چشم بصیرت کو خوبرویانِ مجازی کے پردہ میں شاہد حقیقی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ یہ حضرات نہ صباحت کے شیفتہ نہ ملاحت پر فریفتہ نہ چال ڈھال کے جویا نہ خط و خال کے شیدا ہوتے ہیں۔ بقول حافظ شیراز

ع "بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را"

بلکہ تجلی انوار غیبی جو حجاب بشری میں اپنا جلوہ دکھاتی ہے اور حس کی نرالی شان اور خاص طور کی آن بان ہوتی ہے اُسیکو عاشقان صادق حُسن کہتے ہیں۔ اور اسی کی تلاش اور جستجو میں رہتے ہیں بقول حافظ رح

شاہد آن نیست کہ موئی و میانے دارد   بندۂ طلعتِ آن باش کہ آنے دارد

حضرت حافظ شیراز علیہ الرحمۃ نے یہ حُسن کی تعریف جو مجملاً بیان فرمائی ہے اور جس شان تجلی کا اشارہ بد آنے وارد ہ میں کیا ہے اس سے زیادہ تصریح اس کی ناممکن ہے۔ اس آن کی وضاحت نہ تحریر میں آسکتی ہے نہ تقریر اسکی حقیقت بتا سکتی ہے۔ یہ آن بھی ایک رازِ الٰہی ہے۔ اور اسکا تمیز پیشوائے کامل کی نظر عنایت پر محول ہے۔ نہ دلیل اور تدبیر سے یہ معما صاف ہو سکتا ہے۔ نہ بہ سبیل ریاضت و مجاہدت اس راز کا انکشاف ہو سکتا ہے۔ اسرارِ الٰہی سے آگاہی ہونا مشکل ہے۔ عوام کو یہ مرتبہ کب حاصل ہے مصرع ؎ جان نامحرم نہ بیند روے دوست" اسکی کنجی صرف حضرت عشق کے ہاتھ ہے۔

غرض قلندران ذی مرتبت حُسن کو تجلی انوار حضرت احدیت جانتے ہیں اسی لحاظ سے خوبانِ جہان کو زیادہ مانتے ہیں۔

لیکن بزرگان دین کی یہ بھی ہدایت ہے کہ ابتدائے سلوک میں اگر حُسن حسینانِ جہان کی جانب طبیعت مائل ہو تو اس شرط کے ساتھ کہ قوای جسمانی کو محفوظ اور خواہشات نفسانی کو بکمال اہتمام محبوس رکھے اور فوائد روحانی حاصل کرنے میں سعی اور کوشش کرے ورنہ بجائے منفعت کے نقصان عظیم ہے۔ دوہرہ

رد کے کام کا منا اندری راکھے سادہ

سُندر کے تب درشن کرے نہیں تو ہے اپرادہ

الحاصل قلندرانِ سرمست و خانہ خراب وصالِ یار کے کوشان اور فراق یار میں بیتاب و بیقرار رہتے ہیں۔ وادی جستجو میں مبتلائے آفات ہو کر رنج و صدمات سہتے ہیں۔ اور عیش و آرام کو خیر باد کہتے ہیں۔ طلب دیدار میں دل و جان

بلکہ دین و ایمان نثار کرتے ہیں۔ شوق شاہد یکتا میں خویش و آشنا سے بیزار ہو کر
راہ ملامت اختیار کرتے ہیں۔ کبھی ضبط و سلوک میں خیال کو استقلال کبھی غلبۂ حیرت
سے خاموش رہتے ہیں کبھی بادۂ دیدار سے سرشار اور صورت مجذوب مدہوش
رہتے ہیں۔

چنانچہ حضرات صوفیہ کرام فرماتے ہیں کہ اسی طریق قلندری میں مجاذیب کا
بھی شمار ہے لیکن قلندر صاحبِ مراتب علیا اور فائز مدارج اکمل کو کہتے ہیں جو
تجرید و تفرید میں یکتا اور تمام عالم کا حال اُسپر کشف اور ہویدا ہو۔ اور اکثر جذبات
سے جو مغلوب ہو اُس کو مجذوب کہتے ہیں۔

مجذوب کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اوّل۔ یہ بادۂ عہد الست سے سرشار و مست
ہوتے ہیں۔ کہ ندائے "اَلَستُ بِرَبِّکُم" سنکر اقرار "بَلیٰ" کے ساتھ مشاہدۂ
جمالِ حضرتِ ذوالجلال سے مست ہو گئے۔ اور جب عالم ارواح سے
مقام ناسوت میں آئے تو بدستور تعلقات جسمانی سے دور اور مرادات دینی
و دنیوی سے نفور رہتے ہیں۔ دونوں عالم میں انکی حالت یکساں رہتی ہے۔
یہ دوامی غریق بحر استغراق ہیں ع "چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد" کے
مصداق ہیں۔ اِن کو مجذوب ازلی اور وہبی کہتے ہیں۔ اور۔ اور قسم ثانی کا
خطاب کسبی اور بے اختیاری ہے۔ کہ عالم ارواح سے ذی ہوش آئے۔ مگر کسی
اہلِ دل یا پیشوائے کامل کی توجہ نے جملہ افراد موجودات سے بے خبر اور صاحب
جوش بنا دیا۔

بعض محققین کا ارشاد ہے کہ مجذوب دراصل بذاتِ محبوب کو کہتے ہیں

کہ بغیر بذل وجہد وکسب و لعب اللہ جل جلالہ اُس کو اپنے عطیاتِ مواہب سے سرفراز فرماتا ہے۔ اور وہ بے سعی وکوشش و شدت و کلفت طی مراحل وقطع منازل کرتا ہے۔ اور اصطلاحات صوفیہ میں اس کو سیرِ محبوبی کہتے ہیں۔ اور کوچۂ فقر میں مجذوب کا بڑا مرتبہ ہے۔ **بقول**

ذرۂ جذب عنایت بر ترست | از ہزاران کوشش طالب پرست
جذب یزدان با اثرہا دسبب | صد سخن گوید نہان بی حرف ولب

مجذوب ماسوی اللہ سے بے سروکار اور جمیع مرادات سے دست بردار ہوتا ہے **بقول** حضرت مولانا علیہ الرحمۃ

تا بدانی ہر کہ را یزدان بخواند
از ہمہ کار جہان بے کار ماند

یہ بھی محققین ارباب تصوف نے فرمایا ہے کہ اسی طریق قلندری میں کوئی قلندر بعد قطع مراحل توحید و حصولِ مدارج یافت و دید سے جب خلعت اتحاد و اعزاز وحدت و عبدیت سے ممتاز ہوتا ہے تو بارگاہ احدیت و سرکارِ حضرالوہیت جل شانہ سے اس کو خطاب قطب مدار تفویض ہوتا ہے۔ اس عالی درجات کی ذات مستجمع صفات اہل عالم کو فوائد اور برکات پہونچاتی ہے۔

اور یہ شان و عزت ان مقبولان حضرتِ صمدیت کو بغیر کسی شدت یا صنت و محنت مجاہدت محض عنایت وہبی اور تشریف ازلی کی بدولت نصیب ہوتی ہے قلندران ذی مرتبت کے علاوہ اسی فیضان وہبی و عنایت ایزدی سے فیضیاب شدہ حضرات میں ایک گروہ وہ بھی ہے جنکا لقب اصطلاح

صوفیہ میں سالک ہے۔

جل جلالہٗ یہ بھی حضرت رب العزت کی قدرت اور عظمت کا بین اظہار ہے کہ ایک فیض وہبی اپنے مقبول میں نئی شان اور ہر محبوب میں نرالی آن بان دکھاتا ہے۔

اگر ایک جوش بادۂ الست سے سرشار اور مست ہے۔ تو دوسرا بزم عالم میں ہوشیار اور احکام اوامر و نواہی سے خبردار ہے۔ اگر کسی آزاد و مدہوش کو آیہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکَارٰی یاد ہے۔ تو کوئی عالی درجات پابندِ حکم اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ ہے۔ کوئی رسم ملت کے ظاہری قیود و شعور سے دور۔ کوئی ذی جاہ آثار و اخبار سے بخوبی آگاہ۔ کوئی وارستہ مزاج مستغرق بحرِ وجد و حال ہے۔ کوئی سجادہ سلوک پر پابند ثبات و استقلال ہے۔ کوئی صاحبِ کیف و جوش کوئی اہلِ خرد و ہوش۔ کوئی رند مشرب۔ کوئی پابندِ مذہب ہے۔

اگر عنایت وہبی نے بعض اپنے عاشقانِ برگزیدہ کو خلعت عشق اور تمنائے قلندری سے سرفراز کیا ہے۔ تو اسی فیض ازلی نے اکثر اپنے برگزیدہ بندوں کو اعزازِ سلوک سے ممتاز فرمایا ہے۔ جو معین دین متین اور امینِ حکم رب العالمین ہیں۔

یہ حضرات صاحبِ پند و ہدایات اور باعثِ خیر و برکات ہیں حامل علمِ شریعت عالم علم طریقت ہیں واقف استار حقیقت اور عارف اسرار معرفت ہیں منبع جود و کرم ہیں مصدر فیض اتم ہیں۔ صاحب مدارج و احتشام ہیں معاونِ

ہر خاص و عام ہیں۔ مالک شکوہ و جلالت ہیں۔ مظہر شانِ رسالت ہیں۔ مائل لقای صمدی ہیں۔ واصل لقای احدی ہیں۔

یہ حضرات سالکین ہمیشہ تعمیل فرمانِ رب العالمین۔ اور اتباع سنت جناب ختم المرسلین میں مصروف رہتے ہیں۔ یہی کامل الایمان خطاب "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" سے موصوف ہیں۔ خصائل حضرت نبوی پر مائل تقلید تابعین ہیں کامل۔ امر بالمعروف سے رغبت۔ اور نہی عن المنکر سے اجتناب ہے۔ انہیں جلیل الشان حضرات کا "اَوْلِیَائِیْ تَحْتَ قَبَائِیْ" خطاب ہے۔

انہیں مقبولانِ حضرت رحمان میں کوئی صوفی صافی خیال ہے۔ کوئی درویش صاحب کیف و حال ہے۔ کوئی اہل کشف و شنید ہے کوئی محرم اسرار دید ہے۔ کوئی شیخ زمان ہے۔ کوئی خضر دوران کوئی خواجہ کوئی پشت پناہ ہے۔ کوئی مخدوم کوئی شاہ ہے۔ کوئی ہادی و دستگیر ہے۔ کوئی ولی روشن ضمیر۔ کوئی غوث مالک الرقاب ہے۔ کوئی ابو الوقت اور قطب الاقطاب۔ کوئی ابدال عالی منزلت ہے۔ کوئی اوتاد ذی مرتب کوئی عاشق جان نثار ہے۔ کسی میں شان محبوبیت کا اظہار ہے کسی کو نظارہ جمال جانان کا اشتیاق ہے۔ کسی کو دید یار میں استغراق ہے۔ کوئی فراق مطلوب حقیقی میں بیقرار ہے۔ کوئی تصور محبوب غیبی سے ہمکنار ہے۔ کوئی رنج و ہجر سے رنجور ہے۔ کوئی نشۂ بادۂ وصال میں چور ہے۔

یہ صاحبِ اعزاز بلحاظ مراتب و مدارج تمام عالم و جملہ اہلِ عالم کا ظاہری و باطنی انتظام و انصرام فرماتے ہیں۔ ہر ایک اپنی ولایت میں حاکم اور ذی اختیار ہے۔ مخلوق ان کی فرمان بردار ہے۔

یہ خاصان حق اوراد و وظائف میں مصروف۔ افکار و اشغال میں مشغول رہتے ہیں۔ تجلیات انوار آلٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اور مقامات قرب میں ترقی ہوتی ہے۔ جسکو اہلِ طریقت سیر و سلوک کہتے ہیں۔

حضرات سالکین نے صراحت سیر و سلوک میں فرمایا ہے۔ کہ مسافر راہ سلوک کی ترقی و کامیابی عنایت رہبر کامل پر موقوف ہے کہ مرشد صاحبِ دل کی توجہ باطنی سے پہلے طالب کو تشنگی طلب نصیب ہوتی ہے۔ پھر طالب جب اپنے وجود جسمانی پر غور کرتا ہے تو اپنی مجبوری اور بے اختیاری سے خبردار ہوتا ہے۔ اور یہ اظہار مجبوری اس کے شوق باطنی کا معین ہو کر اس کو طالب معرفتِ حق کی جانب رجوع کرتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا ارادہ مضبوط اور پختہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کی طلب طلب صادق کا مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ طلب صادق قلب طالب میں ایک خاص قسم کی تحریک پیدا کرتی ہے جس تحریک اور حرکت کو اصطلاح ارباب طریقت میں سیر و سلوک کہتے ہیں۔

بعض محققین کا قول ہے کہ طالب راہ خدا کو سفر سیر و سلوک میں پانچ منزلیں اور ہر منزل میں پانچ مرحلے پیش آتے ہیں۔

بعض عارفین کا قول ہے کہ راہِ خدا میں ایسی ترقی کہ سالک با اصل

ذاتِ احدیت ہو عرفِ صوفیہ میں اسی کا نام سیر و سلوک ہے۔

بعض نے فرمایا ہے کہ راہ نوردِ منزل سلوک کی غایت ترقی اور نہایت عروج کو یعنی وہ مرتبہ جو بعد بقای کامل کے نصیب ہوتا ہے اس کو سیر فی اللہ کہتے ہیں۔

اور اصطلاح صوفیہ میں متوجہ ہونا جانب حق تعالیٰ جل شانہ سفرِ حقیقت ہے۔ اور مسافرِ راہِ حق کے واسطے یہ چار سفر ہیں۔

سفرِ اول جسکو سیر الی اللہ کہتے ہیں۔ یہ ایک توجہ سالک ہے کہ بعد ترک مالوفات و عادات سالک جانب وجود متوجہ ہوتا ہے اور افق مبین میں پہونچتا ہے جو مقام دل ہے اور مبدار تجلیات اسمائیہ

سفرِ دوم جسکو سیر فی اللہ کہتے ہیں۔ کہ سالک بعد محو کرلے صورت ظاہری کے سوی باطن توجہ کرتا ہے۔ اس سفر میں مسافر صفات حق سے متصف اور آثار اسماء الٰہی کے ساتھ متحقق ہوتا ہے۔ اور افق اعلیٰ میں پہونچتا ہے۔ تقرب الٰہی میں یہ مقام نہایت رفیع ہے۔

سفرِ سوم جس کو سیر مع اللہ کہتے ہیں۔ کہ ظاہر و باطن معلومات و معقولات کے ترک و قطع کے بعد جب جانبِ حضرت جمع الجمع سالک کی توجہ ہوتی ہے تو مرتبہ عین جمع کا نصیب ہوتا ہے اسی کو مقام اقصٰی کہتے ہیں۔

سفرِ چہارم جس کو سیر باللہ من اللہ کہتے ہیں۔ سالک کی توجہ سوی حضرت اکمل الکاملین بہر تکمیل ہوتی ہے۔ یہی مقام فرق بعد الجمع ہے جس کی تصریح میں محققین کے اقوال بکثرت ہیں۔

یہ حضرات سالکین علاوہ دیگر اختیارات وکمالات باطنی کے علوم ظاہری میں بھی تمام تر واقفیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ مشائخین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ حصولِ علوم حقیقت وتحقیق رموزِ معرفت کے واسطے علوم ظاہری کی بھی تکمیل شرط ہے۔ کیونکہ مشہور ہے کہ ع "بے علم نتوان خدا را شناخت" اور دیکھا بھی جاتا ہے کہ اکثر سالکین جلیل الشان کو ماسوائے کمالات باطنی علوم ظاہری میں بھی فضل حاصل تھا

لیکن اس ارشاد کا مفہوم اگر یہ ہے کہ بعد تکمیل علوم ظاہری حضرات سالکین کو علم باطنی نصیب ہوتا ہے۔ تو شاید یہ ارشاد بطور کلیہ کے نہ ہوگا اس لئے کہ بعض بزرگان دین ایسے بھی ہوئے ہیں جن کے علوئے مرتبت کا اقرار جملہ اربابِ طریقت نے کیا اور اُن کا فضل وکمال دُور دُور مشہور ہوا۔ اور تاریخ کے صفحوں میں اُن کا نام نامی خصوصیت کے ساتھ درج ہے۔ مگر درس علوم ظاہری کی جانب انہوں نے پورا التفات نہیں فرمایا

ہاں اگر یوں کہا جائے تو بہت صحیح ہے کہ مقربانِ بارگاہ احدیت کو علوم ظاہری سے بھی پوری واقفیت بلکہ عبور کامل ہوتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جب سرکار مبدء فیاض سے سالک کو علم باطنی تفویض ہوتا ہے تو بغیر درس وتعلیم بہت قوت باطنی جملہ علوم ظاہری میں اُن کو کمال حاصل ہوتا ہے۔ ورنہ علم باطنی کسی علم ظاہری کا محتاج نہیں اور نہ علم باطنی کے واسطے تکمیل علم ظاہری کی قید اور شرط لازمی معلوم ہوتی ہے اگر علم ظاہری جسم ہے تو علم باطن جان ہے۔ عالم علم ظاہر اہل تن ہیں

اور عالم علم باطن اہل دل اور محبوبانِ حضرت ذوالمنن ہیں۔ بقول مولانا علیہ الرحمتہ۔

علمہائے اہل دل حمالشان
علمہای اہل تن احمالشان

علم را بر دل زنی یارے بود
علم را بر تن زنی مارے بود

گفت ایزد یحمل اسفارہٗ
بار باشد علم کان نبود زہو

خویش را صافی کن از اوصاف خود
تا بہ بینی ذات پاک صاف خود

بینی اندر دل علوم انبیا
بے کتاب و بی معید و اوستا

بے صحیحین و احادیث و رُوات
بلکہ اندر مشرب آب حیات

چنانچہ محققین حضرات صوفیہ نے فرمایا ہے کہ علم کی تین قسمیں ہیں اول علم شریعت ہے۔ جس کے قواعد درج سفینہ ہیں اور جسکا حصول صرف مشق اور کوشش پر موقوف ہے اور جس کی تکمیل سے دینی ضروریات اور دنیوی معاملات کا انکشاف ہوتا ہے۔ اور ہدایت اور ضلالت میں فرق صاف معلوم ہوتا ہے اور اسکا حسنِ کمال درستی اقوال و افعال ہے۔

دوم علم طریقت ہے۔ یہ وہ علم ہے جو تعلق رکھتا ہے تکمیل صفات نفسانیہ و روحانیہ سے بجہت تخلیق بہ اخلاق آلہی۔ اس کا معلم مرشد کامل ہوتا ہے اور اِس کی تعلیم بغیر امدادِ تحریر و تقریر ہوتی ہے۔ اور اسکا طالب علم بے قوت چشم و گوش پڑھتا ہے اور سمجھتا ہے۔ اسی علم کی نسبت مولاناؒ فرماتے ہیں۔

آنطرف کہ عشق می افزود درد
بوحنیفہ شافعی درسے نکرد

سوم علم حقیقت۔ یہ علم معرفت حق ہے۔ اس علم کے ذریعہ سے سالک اسماء و صفات و حقائق ربِ قدیر و قدیم کو پہچانتا ہے۔ اور اسکے حصول کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ سالک کو بغیر استدلال اور برہان مشاہدہ اور اعیان سے یہ علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کو علم ذوقی و کشفی کہتے ہیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بے تامل و تکلف اور بغیر واسطہ و وسیلہ پروردگار کی جانب سے یہ علم حاصل ہوتا ہے۔ اس کو علم وہبی و لدنی کہتے ہیں۔ اسی علم کی نسبت یہ کہنا صادق آتا ہے۔

علم آن باشد کہ جان زندہ کند
مرد را باقی و پائندہ کند

حضرات عارفین اسی علم کے عالم اور ماہر ہوتے ہیں۔ اور اسی علم کی قوت سے جملہ علوم پر قادر ہوتے ہیں۔

الغرض سالکین عالی منزلت کا ظاہری مذاق اور طریقہ یہی خیال کیا جاتا ہے اور باطن کے وجد و حال سے آگاہی ہونا غیر ممکن بلکہ محال ہے۔ کیونکہ یہ خدا کی چھپی ہوئی فوج ہے اِنَّ اللہَ یَاْمُرُکُمْ اَخْفِیَاءَ چشم نامحرم کی مجال نہیں کہ ان کے جمالِ حقیقی اور کمالِ باطنی سے آگاہ ہو۔ ان کے تقرب اور اختصاص کا پورا شعور ہمارے وسعتِ امکان اور احاطہ مقدور سے بہت دور ہے۔

دراصل ذاتِ حقیقی کو وہی پہچان سکتا ہے جو خود محرم اسرارِ غیبی ہو۔ کیونکہ مشہور ہے کہ "دل را دلی میشناسد"۔ بلکہ محققین حضرات صوفیہ نے

تو یہ بھی فرمایا ہے کہ بعض ولی اللہ ایسے ہیں کہ جنکو دیگر اولیاء وقت بھی نہیں پہچانتے ۔حتی کہ بعض حضراتِ اولیا پر اللہ جل جلالہ نے اُن کی شانِ ولایت کا اظہار خود اُن پر نہیں فرمایا۔ چنانچہ کسی بزرگ کا قول ہے مصرع

"در راہِ تو مردان۔ از خویش نہان ماندہ"

اسلیئے اِن کے مراتب و مدارج سے واقفیت اُسی عالم الغیب کو ہے جس کی قدرت کاملہ کی یہ نشانیاں ہیں ۔ اور جس کے فضل و کرم سے ان کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ یہ برگزیدہ اور ممتاز مانے گئے

اور یہ شرف و اختصاص جو محض عنایت پروردگار سے بو ساطت پیشوائے کامل یا بغیر کسی توسل کے بے رنج ریاضت اور شدت مجاہدت حاصل ہوتا ہے جس کو عرف صوفیہ میں عنایت وہبی اور تشریف ازلی کہتے ہیں یہ سعادت بجز فضل واہب العطایا دوسری صورت سے نصیب ہونا ناممکن اور محال ہے۔

اِن مقبولان بارگاہِ احدیت کا مذاق اور مسلک جو مجملاً نگارش ہوا یہی عام طور سے مشہور ہے۔ ورنہ در حقیقت اِن حضرات کے اور کیا کیا خطاب ہیں۔ اِس کا عالم وہی دانائے راز ہے جو تمام عالم کی جان ہے۔

علاوہ اس مخصوص اور برگزیدہ گروہ کے اور ہزاروں جو طالبان راہ طریقت اور سرگشتگان کوچۂ حقیقت ہیں اُن کے فائز اور کامیاب ہونے کے لئے حضرات صوفیہ کرام نے یہ دوسری صورت تجویز فرمائی ہے جسمیں سعی اور کوشش کی مزید ضرورت ہے۔ یعنی طالب کو طلب صادق کے ساتھ

مجاہدت میں محنت شاقہ بھی کرنا لازمی ہے۔ اس لئے طالب راہ خدا کو چاہیئے کہ پیشوائے کامل کے ارشادات کے مطابق عبادت و ریاضت میں پوری کوشش کرے۔ اگر فضل خالقِ قدیر معاون و دستگیر ہے تو وصال شاہد حقیقی کی یہ بھی ایک تدبیر ہے۔

لیکن اپنی ریاضت پر ناز کرنا اور مجاہدت کو سرمایۂ اعزاز سمجھنا یہ ہماری کم ظرفی کی نشانی اور صریح نادانی ہے۔ کیونکہ اُس برتر و ذیشان کا ملنا آسان نہیں ہے۔ وہ ذوالجلال اور صاحبِ اختیار ہے۔ اور ہماری حقیقت خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا سے آشکار ہے ہم کمزور وہ قوی۔ ہم محتاج وہ غنی۔ ہم عبدِ ذلیل وہ رب جلیل پھر کجا ہماری کوشش اور کجا مشاہدۂ جمالِ حضرتِ ذوالجلال اور اُس شاہد یکتا کا قرب اور وصال۔

حق یہ ہے کہ خدا کا ملنا خدا ہی کی عنایت پر موقوف ہے ہمکو یہی سزاوار ہے کہ اُس کی طلب میں اُسی کے فضل و کرم کے امیدوار رہیں۔

اور طالب راہ طریقت کو ارشاد مرشد کامل اور امداد پیشوائے صاحب دل کی ضرورت اس لئے ہے کہ طالب کے امراض باطنی کا علاج یہ اطبائی غیبی یعنی حضرات صوفیہ کرام ہی جانتے ہیں اور اُس کے خوش قلبی کے نقص و عیوب کو خوب پہچانتے ہیں۔ اس واسطے اپنے دست گرفتہ کے تصفیۂ قلب اور تزکیہ روح کے لئے یہ حاذق طبیب وہی مجرب نسخہ تجویز کرتے ہیں جو اُس کے مرض اور مزاج کے مفید ہو یعنی طالب کے ذوق و مذاق جوش و اشتیاق کے لحاظ سے اُس کو اذکار و اشغال تعلیم فرماتے ہیں۔ اور

اپنی توجہ باطنی سے اُس کی طلب کو طلب صادق بناتے ہیں۔ اگر طالب پختہ خیال ہے۔ اور فضل ایزدی بھی شاملِ حال ہے تو یقینی دولتِ وصالِ شاہد حقیقی سے مالا مال ہوتا ہے کیونکہ اکثر بزرگانِ دین اِس ذریعہ سے مستفیض اور مقرب بارگاہ احدیت جل جلالہ ہوتے ہیں۔

اور یہ بھی خیال نہ کیا جائے کہ بعض طریق اہل تصوف میں ذکر وشغل کو لازمی جانا ہے اور بعض میں ضروری نہیں مانا ہے۔ بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوچۂ فقر میں بغیر امتیاز طریق و مذاق اور بے لحاظ مراتب و مدارج جملہ ارباب اہل طریقت تابع حکم فَاذْكُرُونِيْ ہیں۔ کیونکہ حضرات صوفیہ کرام کی تصنیفات و تالیفات اور اُن کے اقوال و اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود بھی ہمیشہ یادِ شاہد حقیقی میں مشغول رہے اور ہم کو بھی اور اوو افکار کی ہدایت فرمائی مثلاً حضرت حافظِ شیراز علیہ الرحمتہ فرماتے ہیں۔

بہ ہیچ درد دگر نیست حاجت ای حافظ　　دعای نیم شب و ورد صبحگاہت بس

ہر نعمت و دولت کہ خدادادی بحافظ　　از یمن دعای شب و ورد سحری بود

اور حضرتِ مولانا قدس سرہ فرماتے ہیں۔

با دلِ پُر درد یاد دوست کُن　　پُر ز یاد دوست مغز و پوست کُن

چونکہ ذاکر باشی ای جویای کام　　در توجہ سوی دل باشی مدام

اور بعض اشعار ایسے بھی ہیں کہ جن میں ذاکر کی آسانی کے واسطے ذکر الٰہی کا قاعدہ بھی لکھ دیا ہے۔ مثلاً۔

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند　　گر نہ بینی سرِ حق بر ما بخند

اسی ذکر کو محاورۂ برج بھاشا میں بھی لکھا ہے۔ دوہرہ

آنکھ ناک مُکھ موند کے نام نرنجن لے

بھیتر کے پٹ تب کُھلیں جب باہر کے پٹ دے

اور حافظ علیہ الرحمتہ نے اپنے اس شعر میں ایک خاص شغل کا اشارہ فرمایا ہے۔ جو آپ کے علوی مرتبت کی دلیل بھی ہے اور یہ شعر گویا زبان حال سے شاہد ہے کہ حافظ صاحب خود اُس متبرک شغل کے عامل تھے اور آپ کی وہ حالت تھی جو حضرات عارفین کی مقام فنا میں ہوتی ہے۔ دھو ہذا۔

کس ندانست کہ منزل گہ آن یار کجاست

این قدر ہست کہ بانگِ جرسے می آید

اور میرے برادر معظم حاجی اوگھٹ شاہ صاحب نے بھی اسی شغل کو ہندی زبان میں نظم فرمایا ہے دوہرہ

کایا کی ممتا تجو اور اپنی سُدھ بسراؤ

موہن مُرلی آن سُنائیں ایسا دھیان جماؤ

بلکہ محققین حضرات صوفیہ فرماتے ہیں کہ تمام مخلوق آلہی اپنی اپنی زبان میں بقدر حیثیت و استعداد یاد خداوندی میں مشغول رہتی ہے حتیٰ کہ بعض مخلوق کی حیات کا مدار صرف ذکر پروردگار پر ہے چنانچہ منقول ہے کہ حشرات الارض کی زندگی ذکر خداوندی پر منحصر ہے۔ جب اُن سے یاد معبود میں غفلت ہوتی ہے فوراً باد اجل اُن کو نیست اور نابود کر دیتی ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ذاکر کی حیثیت کے لحاظ سے ذکر آلہی کی صورتیں

جداگانہ ہوتی ہیں۔ یعنی طالب کی جو حالت ہوتی ہے اسی قبیل سے اُس کو ذکر و شغل تعلیم کرتے ہیں، اور اگر ایسا نہ ہو تو ترقی مدارج میں خلل واقع ہو اور ذاکر کی مجاہدت غیر مفید ثابت ہو۔ کیونکہ ابتدا میں طالب کا خیال و مذاق اور ہوتا ہے۔ پھر جس قدر اُس کے شوق میں ترقی اور طلب میں پختگی ہوتی ہے اسی قدر اُس کی حالت بدلتی جاتی ہے۔ اسلئے جو ذکر اور جس قاعدہ سے ابتدا میں ذاکر کے واسطے تجویز کیا گیا ہے وہ ذکر اور اُس طریقہ سے صاحب سُکر و کیفیت کیواسطے بالکل غیر مفید ہے۔ یا وہ لطیف شغل جو حالت محویت میں عاشقان احدیت کرتے ہیں اگر پہلے ذاکر کو تعلیم کیا جائے تو بجائے فائدہ کے نقصان کا خوف ہوگا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اکثر معمولی سمجھ کے لوگ حضرات کاملین کا طرز و طریقہ اپنی طاعت و ریاضت سے بالکل جداگانہ دیکھ کر یہ خیال کرتے ہیں کہ نہ یہ ذاکر ہیں اور نہ ان کو کسی شغل کی ضرورت ہے، اور یہ خیال اور اندازہ اُن کا ایک طور پر صحیح بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے کہ جو تعریف ذکر کی اُن کے محدود ذہن میں جاگزین ہے یعنی بالجہر یا بالخفا اللہ اللہ کرنا اور جس طریقہ کو وہ شغل جانتے ہیں وہ مجموعی صورت در حقیقت ممتاز اور برگزیدہ بزرگان دین کی ریاضت اور مجاہدت میں نہیں دکھائی دیتی اسلئے بعض ناواقف خیال کرتے ہیں کہ ذکر و شغل فقیر کے واسطے لازمی نہیں اگر ضروری ہوتا تو اکابرین بھی ہماری طرح عامل ہوتے اور زیادہ سے زیادہ کہا تو یہ کہا کہ طالبان راہ طریقت ابتدا میں ذکر و شغل کرتے ہیں۔ اور بعد ترقی مدارج اُن کو کسی ریاضت کی حاجت نہیں رہتی۔

مگر تھوڑا غور کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ہمارے
خیال اور اندازہ کا قصور ہے۔ اور دراصل صحیح یہی ہے کہ طالبانِ خدا
بلحاظ مراتب و مدارج ہمیشہ ذکر الٰہی میں مصروف رہتے ہیں۔ کیونکہ مسلک
طریقت اس قدر لطیف ہے کہ اگر ہر مشرب کا اس کو عطر اور ہر ملت کی جان
کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اور آسان اس قدر ہے کہ ادنیٰ اور معمولی خیال
کے طالب کو بھی اگر اس راہ میں فیوض حاصل کرنے کا شوق ہو تو اس
طریقت کے دارالعلوم میں اس کی بھی گنجائش ہے اور اس کی بھی تعلیم کیواسطے
اس کا باب فیض کھلا ہوا ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ کھلا رہیگا۔ اور چونکہ یہ علم
قلب ہے اس وجہ سے اہل طریقت کے مراتب و مدارج عام طور پر محسوس
نہیں ہوتے۔ البتہ ابتداء میں طالب طریقت کا طرز اور طریقہ ایسا ہوتا ہے
کہ کسی قدر اس کی حالت کا اظہار کرتا ہے اور جس قدر اس کے مدارج میں ترقی
ہوتی ہے یعنی روحی تعلقات بڑھتے ہیں اسی قدر اس کی حالت اور ہیئت کا
اندازہ ہمارے ادراک سے دور ہو جاتا ہے۔ اور یہی مناسبت اس کی
تعلیم میں ملحوظ رہتی ہے کہ ہادیانِ راہ طریقت طالب کو اس کی تنزلی حالت
کے لحاظ سے پہلے ایسا ذکر تعلیم فرماتے ہیں جسکا وہ متحمل بھی ہو اور جو اس کے
تصفیہ قلب کے واسطے مفید ہو۔ بعدہٗ اس کی جس قدر کثافت نفسانیہ
زائل اور روحانیت کی جانب طبیعت مائل ہوتی ہے اسی قدر اس کی
ریاضت میں بھی لطافت بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ جب مرتبہ عینیت کا نصیب
ہوتا ہے اور ذاکر واصل بذاتِ احدیت ہوتا ہے تو اسوقت شغل بے شغلی میں

مشغول ہوتا ہے۔

اسی خیال سے حضرات صوفیہ کرام نے یہ قاعدہ مقرر فرمایا ہے کہ پہلے طالبان راہ طریقت ہدایت مرشد کے موافق اوراد و ظایف کے ساتھ ذکر بالجہر کرتے ہیں۔ جس کا تعلق صرف زبان سے ہے اور ایک وقت خاص اس کے لئے معین ہوتا ہے اس کی کثرت سے طلب ذکر میں ترقی اور شوق میں پختگی ہوتی ہے۔ پھر ایک اسم جناب احدیت جل جلالہ کا ذکر سانس کے ذریعہ سے کرتے ہیں جس کو ذکر خفی اور پاس انفاس اور اصطلاح میں ہوش در دم کہتے ہیں اس ذکر کے واسطے نہ وقت کا تقرر نہ تعداد کا تعین ہوتا ہے بلکہ اہتمام یہ کرتے ہیں کہ ذکر الٰہی سے کوئی سانس نہ خالی جائے چنانچہ افضال ایزدی سے اکثر ذاکرین کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ بغیر ارادہ اور کوشش سوتے جاگتے ہر سانس کے ساتھ ذکر الٰہی کرتے ہیں جب ذاکر مرتبۂ عین الیقین سے ترقی کرتا ہے اور تجلیات انوار الٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے اُس وقت وہ بذریعہ خیال کے ذکر رب العزت کرتا ہے۔ یعنی وصال شاہد حقیقی کے خیال میں ہمہ تن محو اور مستغرق ہو کر فنا ہو جاتا ہے۔ اسکو ذکر حالی بھی کہتے ہیں۔ اس کے بعد جب بزم جمع الجمع میں پہونچتا ہے اور اس کو مرتبہ فنائے اکمل کا حاصل ہوتا ہے تو اس مقام میں ذکر و ذاکر و مذکور کا فرق و امتیاز نہیں رہتا اور سالک شغل بے شغلی میں مشغول ہوتا ہے۔

اب یہ خیال کرنا چاہئے کہ وہ طالب راہ طریقت جو ابتدائی حالت میں ابھی اوراد و ظائف اور ذکر بالجہر کا عامل ہو وہ غریب واصلان ذات

احدیت کے شغل بے شغلی کی کیفیت اور ماہیت کو کیا دریافت کر سکتا ہے اور تحقیق کرلے کی کوشش بھی کرے گا تو اُس کا فیصلہ یہی ہوگا کہ یہ حضرات کوئی ذکر نہیں کرتے۔ حالانکہ یہ غلط ہے اور واقعی امر یہ ہے کہ وہ مقبولان حضرت ذوالمنن جو صاحب فنائی اکمل ہوتے ہیں ایسے اہم اور دشوار طریقہ سے اور روحانیت کے ساتھ ذکر الٰہی میں مصروف اور شغل بے شغلی میں مشغول رہتے ہیں۔ کہ جس کی حقیقت کو دریافت کرنا ہماری عقل اور سمجھ سے بعید ہے۔

چونکہ ہم تنزل کی حالت میں ہیں اور کثافتِ جسمانی اور تکدراتِ نفسانی کی وجہ سے ہماری قوت روحانی مغلوب اور کمزور ہو گئی ہے اس لئے اطبائے باطنی یعنی حضراتِ صوفیہ کرام نے اس کا علاج یہی تجویز فرمایا ہے کہ پہلے ایسا ذکر اور ایسے قاعدہ سے تعلیم فرماتے ہیں کہ آہستہ آہستہ تصفیہ قلب بھی ہو۔ اور رفتہ رفتہ ہم روحانی ترقی بھی حاصل کریں۔

چنانچہ حضرات مشائخین نے ذکر الٰہی کے لئے قواعد منضبط فرمائے ہیں اور ہر قاعدہ کا ایک نام مقرر ہے۔ مثلاً۔ دو ضربی۔ سہ ضربی۔ چہار ضربی۔ شش ضربی۔ ندائی۔ حدادی۔ پاس انفاس۔ حبس دم۔ اسم ذات نفی و اثبات۔ ذکر اسدی۔ ذکر سرمدی۔ ذکر آئینہ۔ ذکر قمری۔ ذکر ملکوتی ذکر جلالی وغیرہ وغیرہ اس کے بعد مراقبہ اور مکاشفہ بھی ضروری گردانا ہے۔

اور خاندان نقشبندیہ میں تعلیم کا طریقہ لطائف ستہ پر موقوف ہے۔ یہ حضرات پہلے اپنی قوت باطنی سے مرید کے قلب پر انوار ذکر الٰہی کا اثر ڈالتے

ہیں۔ جب طالب لطیفۂ قلب سے آگاہ ہو جاتا ہے جس کا رنگ زرد ہے تو لطیفۂ روح پر توجہ کرتے ہیں جس کا رنگ سُرخ ہے۔ بعدہ لطیفۂ سِر کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جس کا رنگ سفید ہے۔ پھر یکے بعد دیگر لطیفۂ نفس لطیفۂ خفی لطیفۂ اخفیٰ پر توجہ کرتے ہیں۔ جن کا رنگ بہت سفید اور سیاہ اور سبز ہے پھر سلطان الاذکار تعلیم فرماتے ہیں۔

ایک طریقہ تعلیم کا یہ بھی ہے کہ اکثر بزرگوں نے طالبِ راہ طریقت کی اصلاح کے واسطے یہ مناسب تصور فرمایا ہے کہ ابتدائی تعلیم بھی طالب کی ریاضت شاقہ کے ساتھ ہو کہ شوق اور طلب میں کامل پختگی آ جائے جو آئندہ کے لئے بہت مفید ہوتی ہے۔ جس طرح سونے کو اگر معمولی طور پر گرم کرو تو کوئی فائدہ نہیں۔ اور وہی بخوبی تپایا جائے تو زنگ اور میل سے پاک ہو جاتا ہے اس لحاظ سے اُن کی مقررہ ریاضت اور مجاہدت جس میں نماز معکوس بھی شامل ہے سخت اور محنت طلب ہے۔ اور طالب کو بہت زیادہ جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

الغرض طالب راہ طریقت کی اصلاح کے لئے بزرگان دین نے تعلیم کے طریقے مختلف تجویز فرمائے ہیں اور وہ بجائے خود مصلحت سے خالی نہیں جس سے طالب کی بنیاد طلب مضبوط اور مستحکم اور اس کے شوق میں ترقی ہوتی ہے اور ذکر الٰہی کا ثمرہ بھی اُس کو یقینی ملتا ہے۔ مگر ادب کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ اصل مقصود یعنی وصالِ شاہدِ حقیقی کے لئے یہ زبانی اور اوراد اور جسمانی ریاضت کافی نہیں بلکہ اس مقصد کے حصول کے واسطے لازمی ہے کہ موجودات عالم سے بیزاری اور خواہشات و مرادات سے دست برداری خیال مطلوب میں

ہمہ تن مصروف رہنا۔ یادِ محبوب میں اپنی ہستی نابود کرنا درکار ہے۔ اور یہ حالت بغیر روحی ترقی کے ممکن نہیں۔ اور طالب کے خیال کو پختگی اور اس کی روحانیت میں ترقی اسی وقت ہوتی ہے جب ایسے اذکار اور اشغال کا عامل ہو جن کو تعلق روح سے ہے۔

اب دشواری یہ ہے کہ اگر وہ اذکار جنکا تعلق محض روح سے ہے ابتدا میں طالب کو تعلیم کیے جائیں تو یقینی اُنکی تعمیل میں وہ قاصر ہوگا کیونکہ اُس کی حیثیت اور استعداد سے باہر ہے۔ اور اگر قواعدِ رائج الوقت کے مطابق طالب سے عمل کرایا جائے تو خیال یہ ہوتا ہے کہ طالب کسی وجہ سے ترقی نہ کرسکا اور اُس کو روحانی تعلیم کی نوبت نہ آئی تو باوجود اس جدوجہد کے وہ حصول مقصود اصلی سے محروم رہا۔ گو یہ زبانی اوراد وظائف اور جسمانی ریاضات بھی اُس کی نجات کے واسطے کافی ہیں لیکن اربابِ طریقت طالبِ نظارہ جمال جانان ہوتے ہیں۔ نہ مائل روضئہ رضوان۔ بقول حافظ علیہ الرحمتہ

"با بہشت و دوزخ و با حور و با غلمان چہ کار"

اسی خیال سے بعض حضرات صوفیہ نے یہ انتظام کیا ہے کہ وہ شغل جس میں صاحبِ مراتب علیا مصروف رہتے ہیں طالب کی آسانی کے واسطے اُس کی چند صورتیں مقرر فرمائی ہیں جن کا طریقہ عمل بھی زیادہ دشوار نہیں۔ اور ابتدا سے انتہا تک طالب اسی شغل کا شاغل رہ سکتا ہے اور روحی ترقی اور باطنی فیوض حاصل کرسکتا ہے۔ اس میں فائدہ یہ متصور ہے کہ اگر طالب کسی وجہ سے مجبور اور قاصر ہوگیا اور پوری کامیابی نہ ہوئی تو بھی مقصود اصلی کا

کچھ حصہ اسکو ضرور مل جائے گا۔

مثلاً مرتبۂ فنا وصول الی اللہ جس کو محض روحانیت سے سروکار ہے اور سفر سلوک میں جو آخری منزل شمار کیجاتی ہے۔ اور معلمین راہ طریقت ریاضات اور مجاہدات کے بعد طالب حق کو فنا کا سبق دیتے ہیں۔ لیکن اکثر حضرات عارفین نے طالب صادق کے واسطے مرتبۂ فنا کو نہایت مختصر اور آسان طریقہ کے ساتھ چند حصوں میں تقسیم فرمایا ہے۔ اور اپنے ارادتمندوں کو ابتدا ہی سے فنا کا سبق دیا ہے۔ اور جس قدر طالب نے مدارج فنا میں ترقی کی اسی لحاظ سے اقسام فنا کی اُس کو تعلیم ہوئی۔ اور یہی سلسلہ طالب کے انتہائی عروج تک قائم رہا اور صرف فنا ہی کی تعلیم اول سے آخر تک ہوئی جس سے طالب فائز المرام ہوگیا اور اس کو مقصود اصلی ضرور حاصل ہوا۔

اِس تعلیم سے قلبِ طالب میں شوق اور جوش پیدا ہوتا ہے اور محبت میں ترقی ہوتی ہے۔ اور بجز آرزوئے وصال مطلوب حقیقی دوسرا خیال نہیں آتا۔ جو طالب کا مقصود اصلی ہے اور اگر کسی وجہ سے طالب کے مدارج فنا میں تکمیل نہ ہوئی تو بھی یہ تعلیم اُس کے واسطے اس لئے مفید ہے کہ طالب ہر حالت میں اسی خیال میں مصروف رہیگا جو اُسکا اصل مقصد ہے۔ اور جس قدر بھی اس راہ میں اُس کو کامیابی ہوگی وہی اس کے لئے کافی ہے۔ کیونکہ پروردگار سے اگر معمولی سروکار بھی ہوگا تو بندہ کے افتخار کے واسطے بس ہے۔

چنانچہ ارشاد فرمایا ہے کہ فنا جو مقامات فقر میں بہت بڑا مرتبہ ہے اور انسان کو انسان کامل بناتا اور بندہ کو خدا سے ملاتا ہے۔ اگر طالب ابتدا ہی سے

مدارج فنا کی تحصیل میں سرگرم رہے اور اس کی تکمیل کے لئے کوشش کرے تو ہر حالت میں اس کی کامیابی ہے۔ اور ہر چند فنا کے مدارج متعدد ہیں اور انکا حاصل کرنا بھی نہایت دشوار ہے۔ مگر مختصر اور آسان طریقہ تعلیم یہ ہے کہ فنا کی تین قسمیں ہیں قسم اوّل فنائی الافعال ہے۔ کہ سالک اپنے اختیار اور جمیع اہل عالم کے اختیارات کی نفی کرے۔ یعنی جملہ حرکات و سکنات اقوال و افعال جن کو اپنے ساتھ یا دوسرے اہل عالم کے ساتھ منسوب کرتا تھا۔ ان کا فاعل حقیقی ذات احدیت جل جلالہٗ کو جانے۔ کیونکہ ماسوی اللہ کسی کی جانب نسبت کرنا طریق فقر میں شرک ہے۔ بقول

صیاد ازل کہ دانہ بردام نہاد — مرغے بگرفت آدمش نام نہاد

ہر نیک و بدے کہ درجہان میگذرد — خود می کند و بہانہ برعام نہاد

قسم دوم کہ فنائی الصفات ہے کہ سالک اپنے اور جمیع کائنات کے صفات کو صفات حق یقین کرے مثلاً علم حلم۔ ارادت۔ قوت۔ عقل۔ فضل مشیت۔ قدرت وغیرہ کو اپنی طرف یا کسی مخلوق کی جانب منسوب کرنا یہ بھی حضرات عارفین کے مشرب میں شرک ہے۔ شعر

گویم بہرزبان و بہر گوش بشنوم — دین طرفہ ترکہ گوش وزبان ہم پدید نیست

چنانچہ سلطان الموحدین حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمۃ کے حالات میں منقول ہے کہ جب آپ اس جہان فانی سے مقام دارالبقا میں تشریف لے گئے تو حضرتِ رب العزت نے آپ کی روح سے خطاب کیا کہ بایزید کیا تحفہ لائے ہو آپنے عرض کیا کہ اے العالمین بایزید تیری بارگاہ احدیت میں

توحید لایا ہے اُس شاہ غیبی نے بہزار ناز فرمایا کہ لا الٰہ اللّبن یعنی ایک شب کو درد شکم میں مبتلا تھے تو مستفسر حال سے تمنے تکلیف کا سبب یہ بیان کیا کہ شبکو دودھ استعمال کیا تھا۔ پس باعث درد شکم دودھ سے منسوب کیا اور کہتے ہو کہ توحید لایا ہوں۔ جل جلالہٗ۔

نکو گوئی نکو گفت است در ذات

کہ التوحید اسقاط الاضافات

مخدوم بایزید کی اس ایک مرتبہ کی نسبت غیر ذات آلٰہی کو کہ دودھ کو سببِ درد شکم کہا اُس پر حضور احدیت سے اعتراض ہوا اور منافی شان توحید سمجھا گیا سچ ہے "جنکے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے" وائے بر ما کہ ہم شب و روز اس بلا میں مبتلا رہتے ہیں۔ وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُھُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَھُمْ مُّشْرِکُوْنَ ؁

قسم سوم فنائی الذات ہے۔ کہ سالک اپنی ذات اور تمامی موجودات کی ذات کو ذات حضرتِ واجب الوجود سمجھے۔ اور اس کا یقین ہو کہ حضرت احدیت جل جلالہٗ نے مرتبہ اطلاق سے نزول فرما کر اس شکل و شمایل میں ظہور فرمایا ہے۔ اور اس کی تصدیق کامل ہو کہ "ہمہ اوست و غیر او موجود نیست"

ہر چہ بینی یار ہست اغیار نیست

غیر او جز وھم و جز پندار نیست

یہی فنای اکمل کی تعریف ہے کہ صاحب فنا کو بجز ذاتِ احدیت کچھ نظر نہیں آتا۔ بقول حضرت جامی رہ

در صورتِ آب و گل عیان غیر تو کیست ‌ ‌ ‌ ‌ در خلوتِ جان و دل نهان غیر تو کیست
گفتی کہ ز غیرِ من بہ پرواز دلت ‌ ‌ ‌ ‌ ای جان جہان در دو جہان غیر تو کیست

یہ مرتبہ عاشقانِ صادق کا ہے۔ اسی کی نسبت حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ یعنی اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا اور اپنی ہستی کو ہستی واجب الوجود کے سامنے نیست اور نابود کرنا ہی عرفانِ الٰہی ہے۔ اور یہی غایت عروج انسانی ہے۔

تا تو ئی از خدا نیابی بوئے
خود بناشی خدا نماید روئے

اور اس کا طریق عمل یعنی مرتبۂ خدا شناسی اور وصول الی اللہ کے حاصل ہونیکا آسان طریقہ یہ تجویز فرمایا کہ پہلے طالب کو لازم ہے کہ تمام عالم کو ایک آئینہ فرض کرلے۔ اور ہمیشہ اُس میں جمالِ شاہدِ حقیقی کا نظارہ کرے اور یہ نسبت ایسی قوی ہوجائے کہ ایک لحظہ بھی نہ اس خیال سے دل غافل ہو نہ اس دیدار سے آنکھ بیکار رہے۔ تھوڑے عرصہ کی کوشش میں جب اس خیال میں پختگی آجائے گی تو عجائبات عالم کا کرشمہ نظر آجائے گا۔ اور قلب کو خاص قسم کی لذت نصیب ہوگی۔ اُس وقت سالک اپنے خیال کو بلند کرے اور تمام عالم کو تصدیق قلب کے ساتھ حق جانے اور چشم حقیقت بین سے حق دیکھے۔ اور کمال پختگی سے تصور کرے کہ یہ اُسی شاہد بے رنگی کا رنگ ہے کہ مختلف شکل و شمائل میں ظاہر ہوا ہے۔ بقول

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش ‌ ‌ ‌ ‌ من انداز قدت رامی شناسم

اور تمامی موجوداتِ عالم میں اُسی واجب الوجود کی ایک ذات کا ظہور

۷۔ بقول

ای غیر ترا بسوی تو سیرے نیست
خالی ز تو مسجدے نے دیرے نیست

دیدم ہمہ طالبان و مطلوبان را
آن جملہ توئی و درمیان غیرے نیست

اس کے بعد آخری کوشش یہ ہے کہ سالک اپنے وجود کو بھی نابود دیکھے صرف اثبات کو قائم کرے اور من و توکی یہ بحث بھی نہ رہے۔ حتیٰ کہ اپنی ہستی فراموش ہو جائے اور ماسواء حق کچھ نہ باقی رہے۔ جب یہ تصور کامل ہو جائیگا تو حجاب تعین اوٹھ جائے گا اور مرتبۂ عینیت حاصل ہو گا پس یہی مقام وصول حق ہے اور "بیخود شدن و از خود رفتن" بھی اسی کو کہتے ہیں۔ اور یہی کمال فقر اور مرتبہ فنافی اللہ ہے۔ بقول۔

آنرا کہ فنا شیوہ و فقر آئین است
نے کشف و یقین نہ معرفت نے دین است

رفت او ز میان ہمیں خدا ماند خدا
الفقر اذا تم ہو اللہ این است

اور بعض عارفین نے طالب راہِ طریقت کی آسانی و نیز مقصود اصلی کے حصول دیافت کے واسطے صرف تصور شیخ کو کافی سمجھا ہے۔ اور اسی ایک تصور کے چند قاعدے مقرر فرمائے ہیں جو ابتدائی حالت میں بھی مفید ہوتے ہیں اور طالب کی غایت رفعت بھی اسی تصور شیخ پر منحصر رہتی ہے بقول حافظ شیراز

گوشۂ محراب ابروی تو میخواہم ز بخت
تا در آنجا ہمچو مجنون درس عشق از بر کنم

اور بعض سالکین متقدمیں جو صاحب مقامات علیا اور اکمل الکاملین تھے

اور پورے اختیارات اور نہایت قوی تصرفات رکھتے تھے اُن کا طریقہ تعلیم بھی اُن کی قوت باطنی کی وجہ سے بہت آسان ہوتا تھا چنانچہ اکثر حضرات کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے تابعین کی تعلیم و تلقین میں کچھ بھی طوالت نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ اُن عالی منزلت پیشواؤں کا فیضان یہ تھا کہ بہت مختصر الفاظ میں ایک ذکر یا شغل کی ہدایت فرماتے تھے۔ اور طالبین اُسی کی تعمیل سے فائز المرام ہوتے تھے۔

الغرض جملہ عارفین کے حالات اور ارشادات سے صاف ظاہر ہے کہ بغیر قید مذاق و ملت اپنے مراتب اور مدارج کے موافق ہمیشہ ذکر جناب باری جل و علا میں خود بھی مشغول رہے اور اپنے مسترشدین کو ذکر حضرت احدیت کی ہدایت فرمائی۔ اسلئے طالب راہ سلوک کو ذکر و فکر و ریاضت و مجاہدت میں پوری سعی اور کافی کوشش کرنا لازمی ہے۔

علاوہ اس کے ذکر محبت کی عین دلیل ہے۔ مَنْ اَحَبَّ شَیْئًا فَقَدْ اَکْثَرَ ذِکْرَہٗ۔ اور حصول مرتبۂ فقر کے واسطے محبت ضروری ہے اس وجہ سے بھی طالب راہ خدا کو ذکر الٰہی میں جدوجہد کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ ذکر مطلوب طالب صادق کی جان بلکہ عین ایمان ہوتا ہے۔ اور آخر میں عشق کامل کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ بجز اسم مطلوب جملہ افراد عالم کا نام عاشق کے صفحۂ علم دیاد سے محو اور سہو ہو جاتا ہے۔ جیسا زلیخا کے قصہ میں مولانا قدس سرہٗ فرماتے ہیں۔

آن زلیخا از سپندان تا بہ عود   نام جملہ چیز یوسف کردہ بود

نام او در تا دہا مکتوم کرد | محرمان زاسرار آں حلوم کرد
صد ہزاران نام اگر برہم زدی | مقصد او زان ہمہ یوسف بُدی
گرسنہ بودی چو گفتی نام او | می شدی او سیر مست از جام او
تشنگیش از نام او رساکن شدی | نام یوسف شربتِ باطن شدی

اور ذکر کی تصریح میں حضرات عارفین نے فرمایا ہے کہ عرف صوفیہ میں ذکر کے معنی یہ ہیں کہ ذاکر یادِ شاہدِ حقیقی میں جملہ موجودات عالم کو فراموش کرے اور ذکر کی تین قسمیں ہیں۔ اول ذکر عام جو قلبِ ذاکر سے غفلت کو دفع کرتا ہے۔ دوم ذکر خاص۔ جو ازالہ تمیز و حجاب عقل ہے۔ سوم ذکر اخص۔ کہ ذاکر ہستی حضرت احدیت کے سامنے فنا ہو کر ذات واجب الوجود میں محو ہو جاتا ہے۔

اور بزرگانِ ماسبق نے ذکر الٰہی کے جو قواعد مقرر فرمائے ہیں وہ بھی ہمارے واسطے یقینی مفید ہیں۔ رہا یہ امر کہ ایک اسم جناب احدیت کا ذکر چند صورتوں سے کیا جاتا ہے لہذا ہم کو کون طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔ یہ مشکل پیشوائے کامل سے حل ہوتی ہے کہ مرید کے ذوق و شوق کے اعتبار سے ذکر الٰہی کا وہی طریقہ تعلیم فرماتے ہیں جو اُس کے درد کا پورا علاج ہو۔

لیکن افسوس اسکا ہے کہ فی زمانا وہ حضرات جنکی ذات عالی سے خیر و برکات کے چشمے جاری ہوں ہماری آنکھوں کو بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ اور اس عہد میں سفر سیر و سلوک بھی محدود ہے اور تعلیم ذکر و شغل کا ایسا طریقہ مروج ہے کہ طالبِ راہ خدا کو منزلِ مقصود تک پہونچنا دشوار ہوتا ہے۔

میرا خیال یہ ہے کہ علاوہ نقص تعلیم کے بڑا سبب اس کا ایک یہ بھی ہے کہ طالب کی کامیابی کا مدار زیادہ تر پیشوا کی توجہ پر موقوف ہے اور آج کل یہ حضرات مشائخین طالب کی ترقی مدارج میں اپنی قوت قلبی اور توجہ باطنی کسی وجہ سے صرف نہیں فرماتے۔ حالانکہ ارباب طریقت کا اتفاق ہے کہ مرید کی کامیابی کے واسطے مرشد کی توجہ ضروری اور لازمی ہے۔ جس قوت کے ساتھ شیخ توجہ دیتا ہے اسی قدر مرید کو ترقی مدارج میں آسانی ہوا کرتی ہے۔

ایک ظاہری نقص یہ ہے۔ جو طالب کے سفر سیر و سلوک میں سدراہ ہوتا ہے کہ مروجہ طریقہ تعلیم راہ طلب میں بجائے معین ہونے کے اس خیال میں مصروف کرتا ہے جو طلب صادق کے بالکل خلاف ہے۔ کیونکہ اکثر ارادتمند تو اسی قعر ذلت یعنی ناسوت کے حدود اربعہ میں محصور رہتے ہیں۔ اور اتفاق سے اگر کوئی طالب عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہوا تو وہ عالم ملکوت کا کرشمہ دیکھکر محو ہو جاتا ہے۔ اور کشف وکرامت کے جھگڑے میں مبتلا ہو کر اسی کو اپنا غائتِ عروج شمار کرتا ہے۔ مگر تشبیہات اور تنزیہات سے بے خبر رہتا ہے۔ نہ صفاتِ حضرت احدیت کی تحقیق ہوتی ہے نہ ذات قدس الوہیت کی تصدیق۔

اس توجیہ سے یہ غرض نہیں ہے کہ وہ روحانی ترقی جس کو عرف صوفیہ میں مقام ملکوت کہتے ہیں بیکار ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ مقصود میرا یہ ہے کہ اس حالت کو منزل مقصود اور کمال فقر نہ خیال کرنا چاہئے۔ حالانکہ یہ حالت بھی

قابل فخر و قدر ضرور ہے۔ مگر یہ مقام وہ نہیں ہے جو طالبان راہ طریقت کی پہلی اصلی کوشش اور دلی خواہش ہوتی ہے کہ اسرار حجاب حقیقت سے خبردار رہوں۔ اور ہستی واجب الوجود کے سامنے فنا ہو کر وصالِ شاہد حقیقی نصیب ہو۔

طریقۂ تعلیم مروجہ میں ایک امر قابل غور یہ بھی ہے کہ جو اکثر بجائی کامیابی طالب کے شوق کو مضمحل کر دیتا ہے۔ کہ بعض حضرات مشائخین محض اپنی شفقت سے ابتدائی حالت میں اس قدر، اوراد و وظائف اور ذکر و شغل تعلیم فرماتے ہیں کہ اگر طالب رات دن مسلسل کوشش کرے تو بھی مطابق ہدایت تعمیل ناممکن ہے پس علاوہ تفکرات و تعلقات دنیاوی کے جو بشریت کے لوازمات میں سے ہیں اگر طالب آزاد بھی ہے اور بلحاظ تعمیل ارشاد اس نے کوشش بھی کی تو ابتدائی حالت میں ہر وقت یکسوئی رہنا دشوار ہے۔ اور چونکہ اطمینان اور جمعیت خاطر میں فرق آتا ہے۔ اس لئے طبیعت گداز نہیں ہوتی اور ریاضت بے لطف معلوم ہوتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ شوق و طلب میں تنزلی پیدا ہو جاتی ہے۔ لہذا التعلیم اذکار ایسے معیار کے ساتھ ہو کہ ذاکر کو تکلیف بھی نہ ہو اور بکمال شوق اسکی تعمیل کر سکے لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

غرض حضرات مشائخین کو ضرور اس کی اصلاح کی جانب متوجہ ہونا چاہیئے اور شاید اس سے بہتر اور آسان طریقہ اسکی اصلاح کے واسطے اور کوئی نہ ہوگا کہ طالب راہ طریقت کو اذکار اور اشغال ایسے تعلیم کئے جائیں کہ اول تو جن کی تعمیل ذاکر کو ایسی دشوار نہ ہو جو اس کے شوق کو مضمحل کر دے۔ اور دوم جنکا

ماحصل اور نتیجہ لازمی صرف وہی ہو جو طالب کا اصل مقصود ہوتا ہے۔ یعنی ہر مقام اور ہر حالت میں محض ذاتِ حضرت سبحانہٗ سے ذاکر کو تعلق رہے اس میں فائدہ یہ ہوگا کہ اگر طالب سیر و سلوک میں پورا کامیاب نہ بھی ہوا در منزل مقصود تک نہ پہونچا تو بھی اس کو جو کچھ تعلق ہوگا وہ ذات حضرت احدیت ہی سے ہوگا اور ذاتِ باری جل جلالہٗ سے معمولی تعلق بھی بہت ہے ؏

"بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است"

چونکہ میں اس کوچہ سے قطعی نابلد ہوں۔ اور سمجھتا ہوں کہ میری رائے اس معاملہ میں کہ طالبین کس طریقہ سے ذکر رب العزت کریں جو اُن کی کامیابی کے واسطے یقینی مفید ہو ہرگز اس قابل نہیں ہوسکتی کہ اُس پر اعتبار کیا جائے اور بوجہ نا اہل ہونے کے مجھ کو زیبا بھی نہیں تھا کہ ایسے دقیق مسئلہ میں دخل دیتا۔ لیکن میرا یہ ارادہ کرنا دو سبب سے ہوا۔ اول تو ایک وجہ خاص ہے جس کا تصریح کے ساتھ ظاہر کرنا منظور نہیں ہے۔ مگر دوسری وجہ کہ ارباب طریقت کا یہ خیال کہ "ہر آواز کو سروش غیبی سمجھنا" ایسا ہے کہ جسکے سبب سے یہ جرأت ہوئی کہ میں بھی اپنی ناچیز رای اس باعظمت گروہ کے سامنے پیش کروں۔

اب اہل ذوق و شوق کو اختیار ہے کہ اس طریق ریاضت کو کلیتہً پسند فرمادیں یا بمصداق "خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا كَدَرَ" یعنی جس قدر حصہ اس کا مناسب حال متصور ہو اُسی پر عمل کریں۔ اور میری جہالت کو نظر انداز فرماکر یہ غور کرنا چاہیئے کہ میں کہتا کیا ہوں۔ کیونکہ

مشہور مقولہ ہے کہ "انظر الی ما قال ولا تنظر الی من قال" لیکن اس کی امید ضرور ہے کہ طالبان صادق اگر اس طریق ریاضت میں کوشش کریں گے تو لازمی ہے کہ فائدہ اٹھائینگے۔

میرا خیال یہ ہے کہ اگر طالب دل گداز اور طلب صادق رکھتا ہے تو شغل سلطان الاذکار اس کو بہت زیادہ مفید ہوگا۔ کیونکہ اکثر حضرات سالکین کو اسی شغل نے برگزیدہ اور خدا رسیدہ بنایا ہے۔ اور جملہ عشاق ذی مرتبت اور قلندران عالی منزلت نے خود بھی یہی طریقہ اختیار کیا اور اپنے تابعین کو بھی اسی شغل کی ہدایت فرمائی۔ اور تمام محققین کا اتفاق ہے کہ طریق خدا طلبی میں شغل سلطان الاذکار سے بہتر کوئی دوسری صورت کامیابی کے واسطے نہیں ہے۔ اس لئے اب طالبان راہ طریقت سے ادب کے ساتھ یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر مقصود آپ کا صرف خدا طلبی ہے اور محض شاہد حقیقی سے سروکار پیدا کرنا مطلوب ہے تو براور اس دنیائے فانی کی نمود و شہرت اور خلق اللہ کو محبوس اور گرویدہ کرنے کے واسطے یہ کشف و کرامت کا جال آپ کے اصل مقصود کے منافی اور آپکے شائستہ خیال کی ضد ہے۔ خدا اس کو ملتا ہے جو ماسوی اللہ کے تعلقات کو منقطع کرے اور ہستی ذات احدیت کے سامنے اپنی ہستی کو مٹائے اور حضرت واجب الوجود کی راہ جستجو میں خاک ہو جائے۔ پس اگر آپ کی طلب صادق اور آپکا شوق کامل ہے تو آپ کے کامیابی کے واسطے صرف تصور شیخ اور شغل سلطان الاذکار کافی ہے۔ اور انشاء اللہ بہت جلد اسی تصور اور اسی شغل میں

کوشش کرنے سے آپ فائز المرام ہوں گے۔ اور اس سے زیادہ مفید اور آسان کوئی طریقہ نہیں جو راہ طلب میں آپ کا رفیق صادق ہو۔

بعض حضرات سالکین نے شغل مذکور کا طریقہ جو اپنے معتقدین کو تعلیم فرمایا ہے۔ گو وہ بھی طالب راہ خدا کی ہمت کے مقابلہ میں زیادہ دشوار نہیں ہے۔ لیکن اس قدر محنت اور ریاضت کی ضرورت اس میں یقینی ہے کہ پہلے سے طالب ذاکر اور شاغل اور نفی و اثبات سے بخوبی واقف اور پاس انفاس میں پوری مہارت رکھتا ہو اور شوق کے ساتھ کم سے کم ایک سال تک مسلسل مشق اور کوشش اور سعی بلیغ کرے تو ابتدائی نتیجہ اس کا حاصل ہو۔ اور اس انتظار اور توقف کا باعث یہ ہوا کرتا ہے کہ عموماً پیشوا اپنے طالبین کو شغل سلطان الاذکار کا طریقۂ عمل بجائے تصریح اور تشریح کے اشارتاً تعلیم فرماتے ہیں۔ اور اکثر تو اسی پر اکتفا کرتے ہیں کہ حافظؒ اور جامی کے وہ اشعار یا ہندی کا وہ دُوہا جس میں شغل مذکور کی جانب اشارہ ہوتا ہے فقط اُسی کو پڑھکر سنا دیتے ہیں۔ اسی وجہ سے شاغل کو طرح طرح کی دقتیں پیش آتی ہیں اور کامیابی میں عرصہ ہوتا ہے۔

اُس کے بعد جب وہی طالبین جن کو پیشوا نے شغل سلطان الاذکار اشارتاً تعلیم فرمایا ہے خود رہنما ہوئے اور ان کے رشد و ہدایت کا نشان بلند ہوا۔ اور انہوں نے اپنے معتقدین کو صورتِ سرمدی کی جب ہدایت فرمائی تو وہی اشارہ جس کے سمجھنے میں خود دشواریاں اٹھائی تھیں یعنی سلطان الاذکار کے طریقۂ عمل کو کتمان کا جامہ پہنا کر اور معمولی الفاظ کے پردہ میں بطور چیستان

بیان کیا۔ اب ان کے مریدین کو اس راز کے سمجھنے میں اور زیادہ مشکل ہوئی۔ علیٰ ہذا دو تین پشتوں کے بعد شغل موصوف کا طریقہ عمل ایک قسم کا معما ہو جاتا ہے آج جسکا رفتہ رفتہ نتیجہ یہ ہوا کہ عنقا کی طرح صرف نام صوت سرمدی کا تو ضرور باقی ہے مگر اس کے طرز عمل کا علم بہت محدود ہو گیا۔ اور ایسے مفید شغل کی تعلیم گویا موقوف ہو گئی۔ اور اگر اتفاق سے کوئی پیشوا اس کی ہدایت فرماتا بھی ہے تو اس اہمیت کے ساتھ کہ مجبوراً طالب اس کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ لہذا یہ وقت بھی آپ کو انشاءاللہ نہ پیش آئیگی کیونکہ شغلِ سلطان الاذکار کا طریقہ عمل نہایت تفصیل اور تصریح کے ساتھ نگارش کروں گا۔ اور امید ہے کہ شاغل کو بہت آسانی سے پوری کامیابی حاصل ہوگی وَاللہُ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَیْہِ التُّکْلَانُ
اب مجھ کو لازم تھا کہ وہ طالبانِ راہ طریقت جو شوق کامل اور طلب صادق رکھتے ہیں اُن کی آگاہی کے واسطے صرف تصور شیخ کا ایک آسان طریقہ اور فقط شغلِ سلطان الاذکار کو تصریح کے ساتھ نگارش کرتا۔ لیکن ایسے ناز پروردہ شائقین راہ طریقت جو ابھی خواب غفلت سے چونکے ہیں اور جن کے دل میں شوقِ وصالِ الٰہی نے اپنا گھر بنانے کے لئے ابھی بنیاد ڈالی ہے۔ اور وہ مسافران راہ سلوک جنہوں نے اس وادی غیر محدود کی پہلی منزل طے کرنے کے واسطے ابھی کمر باندھی ہے اُن کے ساتھ اس توشہ کی بھی ضرورت ہے کہ پہلے اُن کی طلب طلبِ صادق اور اُن کا شوق شوقِ کامل ہو۔ اور پھر شغل سلطان الاذکار اُن کا خضر راہ بنکر اُن کو دیار شاہد حقیقی میں پہونچائے۔ اور وہاں کا عیش دائمی اُن کو نصیب ہو۔ اس خیال سے

ضرور ہوا کہ پہلے بہت اختصار کے ساتھ بزرگان دین کی وہ ہدایتیں بھی لکھدوں جو ابتدائی حالت میں کام آتی ہیں۔ اور جن کو طالب راہِ طریقت کی بسم اللہ کہنا چاہیئے۔ بلکہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ طالب خدا کو شوق وصال میں اور کثرت اذکار و اشغال کی وجہ سے جو انقلابات اور تغیرات پیش آتے ہیں انکو بھی سلسلہ کے ساتھ نگارش کردوں۔ اور طالب راہ طریقت کی حالت قلبی کی تبدیلیوں کو انہیں الفاظ میں لکھوں جو عرف صوفیہ میں مشہور ہیں۔ کیونکہ طالب کی ہر ایک حالت کا اصطلاحات صوفیہ میں ایک خاص نام ہے مثلاً شکر۔ کیفیت۔ فراق۔ وصال۔ قبض بسط۔ فنا۔ بقا۔ ناسوت۔ ملکوت۔ جبروت۔ لاہوت وغیرہ۔

اس عنوان سے اگر اپنا خیال ظاہر کردوں گا تو ہر شخص اپنی اپنی خواہش اور ضرورت کے مطابق فائدہ حاصل کرسکتا ہے ورنہ صرف شغل سلطان اذکار کو صراحت کے ساتھ اگر نگارش کرتا تو میری یہ تحریر انہیں طالبین کے واسطے بکار آمد ہوتی جنکے دل گداز اور آتش شوق سے بہرہ مند ہیں۔

پس میرے خیال میں پہلے طالب راہ طریقت کے واسطے پیشوائے کامل کا توسل لازمی اور بہت ضروری ہے۔ پھر موافق ہدایت شیخ۔ فرائض وغیرہ سے فارغ ہوکر درود شریف کی کثرت اور اوراد و ظائف کا معمول کرے کہ یہ ریاضت ظاہری بھی موجب تصفیۂ قلب ہوتی ہے۔ اور کتب احادیث میں اور اد و وظائف کی فضیلت مذکور ہے۔ چنانچہ جناب سرور عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے کلمہ طیبہ و نیز اسم ذات کے ورد کیلئے

بہت تاکید فرمائی ہے۔ اور بعض حضرات مشائخین نے طالب کے واسطے بائیس ہزار چار سو اور بعض نے چوبیس ہزار مرتبہ اسم ذات کا روزانہ ورد ضروری سمجھا ہے کیونکہ شب و روز میں اسی قدر انفاس کا شمار کیا گیا ہے اور جب عنایت جناب باری سے وصال شاہدِ حقیقی کا جوش دلمیں پیدا ہو تو اُس کے علاج کے واسطے اطبای امراض باطنی یعنی حضرات مشائخین عظام نے ذکر جنابِ احدیت جل جلالہ تجویز فرمایا ہے۔ چونکہ ذکر نسیان کی ضد ہے اور معبود حقیقی کی طرف متوجہ کرتا ہے اسلیئے عین عبادت ہے۔

طالب کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس عالم کا عرف صوفیہ میں عالم ناسوت نام ہے۔ اور اسی کو عالم شہود۔ عالم ملک۔ عالم بیداری عالم مثال بھی کہتے ہیں۔ اور یہ غائتِ مقام تنزل ہے۔ اور انسان کی حقیقت باطنی کے علاوہ ظاہری ایک وصف اس کا یہ ہے کہ یہی حضرت صفات و ذات کے مظہر جامع اور تعلیات عالم میں بار امانت اٹھانے میں ممتاز ہیں۔ پس کمالِ انسان اسی میں ہے کہ جس دریائے بیرنگی سے قطرہ وار نکلا ہے پھر اُسی میں فنا ہو۔ یعنی نیست و نابود ہو کر ذاتِ حضرت واجب الوجود سے مل جائے۔ جو عین ہستی ہے اور جس کو اصطلاحات صوفیہ میں فنا فی اللہ کہتے ہیں۔ لہذا اس کوشش کے لئے ابتدا میں آسان طریقہ یہ ہے کہ طالب کو لازم ہے کہ پہلے تنگ اور تاریک مکان میں تنہا اور باطہارت دوزانو قبلہ رو ہو کر صورتِ شیخ کا تصور کرے۔ اور اگر کسی کا دست گرفتہ نہ ہو تو محبوباً جس سے ربط محبت یا تعلق عشق مجازی ہو اس کا تصور کرے

مگر مسلم الثبوت ہے کہ راہ طریقت میں اہل کسب کو بغیر وساطت مرشد فیض بمشکل اور عرصہ میں حاصل ہوتا ہے۔

محققین حضرات صوفیہ نے تصور کے قواعد مختلف طور پر ارقام فرمائی ہیں۔ انہیں میں سے ایک طریقہ اختیار کرے۔ لیکن بہت آسان اور مفید طریقہ ایک یہ ہے کہ جملہ تعلقات عالم سے قلب کو صاف کرے اور یک سوئی اور جمعیت خاطر کے ساتھ صورت شیخ کا خیال کرے اور جب صورت شیخ مستحکم طور سے خیال میں آجائے تو فوراً مع اس خیال کے اپنے قلب کی جانب متوجہ ہو اور چشم دل سے جمال مرشد کا نظارہ کرے اگر طلب صادق اور شوق کامل ہے تو اس طریقہ سے بہت جلد طالب کو تصور کرنے میں کامیابی ہوگی کیونکہ یہ طریقہ اکثر خطرات کو روکتا ہے۔ اور بہتر ہوگا کہ تصور کرنے میں آنکھیں نہ بند کیجائیں جس کا فائدہ آگے محسوس ہوگا اگر اس میں کوئی دشواری ہے تو اسی قدر کہ قلب کی جانب متوجہ ہو اور چشم دل سے برزخ شیخ کا نظارہ کرے۔ لیکن فضل الٰہی شامل حال ہے تو کوئی مشکل ایسی نہیں جو آسان نہ ہو۔ بقول

مرد باید کہ ہراساں نشود
مشکلے نیست کہ آسان نہ شود

اگر طالب شوق و محبت کے ساتھ سعی اور کوشش کریگا تو امید ہے کہ بہت جلد صورتِ شیخ کا تصور قائم ہونے لگے گا۔

چونکہ تصور کرنے میں قلب کی جانب متوجہ ہونا مذکور ہوا ہے اسلیئے

اس کی بھی تصریح لازم ہے کہ قلب کس کو کہتے ہیں۔ لہذا مشائخین عظام کا قول ہے کہ سینہ کے بائیں جانب زیر پستان مقام قلب ہے اور عرف عام میں اسی کو دل کہتے ہیں۔

لیکن اہل باطن نے اس کی تشریح یہ فرمائی ہے کہ جسم انسان میں دل کے تین مقام ہیں۔ اوّل اندرون سینہ زیر پستان چپ اس کو دلِ صنوبری کہتے ہیں۔ کیونکہ اس ٹکڑہ کی شکل صنوبر کی ہے۔ اور یہ دل انسان اور حیوان کا مشابہ ہوتا ہے۔ دوسرا دلِ اُم الدماغ ہے اور اس کا دل مدور نام ہے اور اس کو دلِ بیرنگ بھی کہتے ہیں۔ اور خاصیت اس دل میں یہ ہے کہ جب فقیر اس دل کی جانب متوجہ ہوتا ہے تو کسی معلومات اور تعلقات کا خطرہ نہیں ہوتا کیونکہ دل مدور میں خطرہ کی گنجائش نہیں۔ تیسرا دل جو درمیان پشت گاہ ہے اس کو دل نیلوفری کہتے ہیں۔

اگر طالب صاحب حوصلہ اور عالی ہمت ہے تو علاوہ تصور کے طالب کو کسی وقت میں ذکر بالجہر بھی کرنا مناسب ہے کہ ذکر جلی طبیعت کو گداز کرتا ہے اور شوق میں ترقی ہوتی ہے۔ اور اس کے لئے آخر شب زیادہ موزوں ہے۔

ذکر بالجہر کے جو طریقے مشہور ہیں ان میں سے ایک صورت کو اختیار کرے۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ پہلے طالب ذکر نفی و اثبات چہار ضربی کا عامل ہو۔ اس لئے کہ یہ طریقہ آسان بھی ہے اور مفید بھی۔ اس کے بھی

چند قاعدہ ہیں منجملہ اُن کے ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ تنہا مکان میں قبلہ رو ہوکر دوزانو بیٹھا ورآغاز کلمہ لا بائیں زانو کے شروع سے کرے اور داہنے شانے تک کلمہ آلہ پہونچائے اور یہاں دم کو راست کرے اور فضائے قلب پرالااللہ کی قوی ضرب لگائے۔

اور اکثر متقدمین نے اس ذکر کا طریقہ یہ ارشاد فرمایا ہے کہ چہار زانو قبلہ رو بیٹھے اور پیٹھ سیدھی رکھے اور داہنے پانوں کے انگوٹھے اوراس کے پاس والی انگلی سے بائیں پانوں کی رگ کیماس کو زور سے پکڑے تاکہ قلب میں حرارت پیدا ہو جو تصفیہ کا باعث اور خطرات کا تحفظ ہے اور بجمعیت خاطر ایک دل اور ایک زبان ہوکر بمقتضائے وقت اور طبیعت آہستہ یا جہر سے ذکر میں مشغول ہو۔ اور اس شعر میں جو شرائط ہیں اُن کی رعایت کا لحاظ رہے۔

برزخ و ذات وصفات و مدو شدٌ تحت وفوق
می نماید طالبان راکلُ نفس ذوق و شوق

یعنی برزخ سے تصور شیخ مراد ہے، اور ذات سے وجود مطلق حضرت واجب الوجود۔ اور صفات سے ساتوں امام مراد ہیں جو عرف صوفیہ میں مشہور ہیں کہ حیاتؔ ۔ علمؔ ۔ قدرتؔ ۔ ارادؔہ ۔ سمعؔ ۔ بصرؔ ۔ کلامؔ ۔ اور مدؔ سے مراد یہ ہے کہ کلمہ لا آلہ کو کھینچے اور شد سے مراد الااللہ کی ضرب ہے اور تحت کا اشارہ ابتدا کلمۂ لا کی بائیں زانو کے شروع سے اور آلہ کا داہنے شانے تک پہونچانا۔ اور فوق شانہ سے قلب کی جانب متوجہ

ہونا مراد ہے۔

اور اگر طالب نحیف اور کمزور ہو تو وہ ذکر دو ضربی پر اکتفا کرے جس کا طریقہ یہ ہے کہ دمبدم داہنے شانہ پر لا آلہ کی ایک ضرب اور فضائی دل پر الا اللہ کی دوسری ضرب لگائے۔ اور پانچ سات مرتبہ کے بعد محمد الرسول اللہ کہہ لیا کرے۔ اور چونکہ یہ نسبت ذکر چہار ضربی کے اس میں بساطت نہیں ہے اسوجہ سے اس میں تفرقہ نہیں ہے۔

اور جس وقت تخلیہ اور اطمینان ہو تو یہ شغل بھی کیا کرے کہ آنکھیں کھولے رہے اور اوپر یا سامنے نظر ڈالے اور اہتمام کے ساتھ اس کا خیال رہے کہ پلک نہ بند ہو۔ اس شغل سے کچھ انوار ظاہر ہوتے ہیں اور پلکوں سے وہ آگ بھڑکتی ہے جو تمام بدن میں پھیلتی ہے اور عشق پیدا ہوتا ہے۔

غرض پہلے طالب کے واسطے تصور شیخ مقدم اور لازمی اور ایک ذکر اور ایک شغل کافی ہے۔ اس میں وقت بھی کم صرف ہوگا اور یہ ریاضت شاقہ زیادہ دشوار بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ بغیر کسی تکلیف کے طالب اسکا عامل ہو سکتا ہے۔

اگر تصور یا ذکر یا شغل میں کوئی دشواری پیش آئے تو طالب کو لازم ہے کہ ناامید نہ ہو۔ اور ثبات و استقلال سے کام لے۔ عنایت ایزدی اور تائید غیبی وادی طلب میں رہبری کرے گی۔ اور یقین ہے کہ تھوڑے عرصہ میں طبیعت گداز ہو جائیگی۔ شوق وصال میں ترقی اور قلب میں مزہ اور خاص قسم کی حرارت پیدا ہوگی۔

اور اگر کسی سبب سے طالب اس معمولی محنت کا بھی متحمل نہ ہو یا کسی خاص مجبوری سے قاصر ہو تو اسی کی کوشش کرے کہ تصور شیخ قائم ہو جائے کیونکہ طالب کو اس عالم ناسوت میں صرف تصور پیشوا سے یہ فیض حاصل ہو سکتا ہے کہ رفتہ رفتہ صورت متصورہ قائم ہوتی ہے۔ اور ثقل محسوسات اور کثافت خطرات سے قلب صاف ہوتا ہے اور یہی تصور باعث فتح باب ملکوت ہوتا ہے۔

جب عالم مثال کے ثقل و کثافت پر روحانیت غالب ہوتی ہے تو قلب طالب کو فی الجملہ اطمینان اور تیقن ہوتا ہے۔ اسی کا اصطلاح صوفیہ میں عالم ملکوت نام ہے۔ اور عالم ارواح۔ عالم غیب۔ عالم لطیف عالم خواب بھی اسی کو کہتے ہیں۔

صورت عالمِ ناسوت فنا پذیر ہے اور صورت عالم ملکوت فنا سے محفوظ اور اصل صورتِ ناسوت ہے۔ انسان میں ناسوتی اور ملکوتی مادہ کا اجتماع ہے یعنی جسم اور روح۔ مگر اصل انسان لطیف ہے اگر صحبتِ جسم کا اثر روح پر غالب ہوتا ہے تو روح بھی بوجہ مغلوب ہونے کے مثل جسم کے مکدر ہو جاتی ہے۔ جس کی اصلاح کے واسطے حضرات صوفیہ نے اذکار و اشغال تجویز فرمائے ہیں۔ اور کبھی صحبت روح جسم پر غالب ہوتی ہے اور جسم بھی مثل روح کے لطیف ہو جاتا ہے جیسے روح جنابِ بہترین عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جسم شریف کو بھی مثل اپنے لطیف اور مصفا بنا لیا کہ نہ اُس پر کبھی مکھی بیٹھی نہ سایہ زمین پر گرا۔

پس عنایت رب العزت سے جب طالب کو سیرِ ملکوتی نصیب ہوتی ہے یعنی کثافت جسمانی پر اثر ملکوتی جس کو روحانیت کہتے ہیں غالب ہوتا ہے تو اس عالم کی مخلوق کو طالب دیکھتا ہے اور ان کی تسبیح کی آواز سنتا ہے اور مختلف مدارج کی روحیں نظر آتی ہیں۔

طالب کو چاہیئے کہ اس حالت میں پہلے جناب احدیت جل جلالہٗ کا شکر بجالائے اور تھوڑا عرصہ اور سکوت کرے تاکہ حقیقت عالم لطیف سے جو عالم اصل ہے قلب خوب واقف ہو جائے۔ اور سمجھے کہ یہ عالم جو اس وقت پیشِ نظر ہے اور جس کی لطافت یہ شان دکھارہی ہے اُس عالم کا یہ سایہ ہے جس کا نام عالم اصل اور عالم حقیقی ہے اور جو ہمارا عین مقصود ہے۔

جب قلب کو پورا یقین اور عالم اصل کے ساتھ کامل طور پر نسبت ہو جائے تو عرف صوفیہ میں اسی کو فتح عالم ملکوت کہتے ہیں۔

لیکن طالبِ راہ سلوک کو اس عالم ارواح کی لطیف صورتیں اور خوشگوار آوازیں ایسا مائل کرتی ہیں کہ اکثر مسافر سیر و سلوک اسی منجدھار میں قیام کرتے ہیں اور جوش محویت میں سمجھتے ہیں کہ یہی منزلِ مقصود ہے۔

اس لئے طالب کو سفر سیر و سلوک میں ہمیشہ عجز و انکسار کے ساتھ امداد غیبی اور اعانت مرشد کامل کا طلبگار رہنا چاہیئے۔ اور اس عالم ارواح کے عجائبات پر مائل نہ ہو۔ اور کشف و کرامت کی خواہش نہ کرے کیونکہ یہاں کشف و کرامت کا بھی دام ایسا ہے کہ طالب کے طائرِ شوق کو اسیر کرتا اور جو ارشاد حقیقی کی بہار دیکھنے سے محروم رکھتا ہے۔ پس لازم ہے

کہ اس عالم ارواح کے عجائب وغرائب پر التفات نہ کرے کہ یہاں کے کرشمے سفر سیر وسلوک میں سدراہ ہوتے ہیں۔ اور اس عالم کا غلبہ کو حایت سالک کو محو اور بے خود کرتا ہے۔ اور اس حالت میں مرشد کامل کی رہنمائی اور دستگیری کی خاص ضرورت ہے۔

حضرات صوفیہ کرام نے یہ بھی فرمایا ہے کہ سیر عالم ملکوت میں مناسب ہے کہ مسافر راہ سلوک کے ہمراہ کوئی ظاہری توشہ بھی ہو۔ وہ یہ کہ بعض اشغال ایسے ہیں جو قلب طالب کو منور اور مصفا کرتے ہیں۔ اور اطمینان اور جمعیت خاطر کا باعث ہوتے ہیں۔ اور زنگار تعلقات سے آئینۂ دل کو صاف کرتے ہیں کہ جمال شاہد حقیقی کے مشاہدہ میں قلب سالک مکلف اور متردد نہ ہو۔

چونکہ اس حالت میں طالب صادق اسرار الٰہی سے واقفیت اور آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہے اس لئے لازم ہوا کہ حضرت احدیت جل جلالہٗ کا ذکر بھی کتمان کے ساتھ کیا جائے۔ اور ارباب مشائخین نے وہ ذکر جو کتمان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ذاکر کی آسانی کے واسطے طریقے اُسکے مختلف طور پر ارقام فرمائے ہیں جن میں بعض ذکر خفی اور بعض کو پاس انفاس کہتے ہیں۔ اور قریب قریب جملہ حضرات صوفیہ نے فرمایا ہے کہ اس حالت میں پاس انفاس زیادہ مفید ہوتا ہے۔

چنانچہ ایک طریقہ عمل اُس کا یہ ہے اور اکثر حضرات اس کی ہدایت فرماتے ہیں کہ جب ذاکر پاس انفاس کا ارادہ کرے تو پہلے اپنی ہر سانس پر نظر رکھے اور

جب سانس باہر آئے تو دل کی زبان سے کلمہ لا الٰہ کہے اور خیال کرے کہ ماسوائے خدا جملہ موجودات کی محبت کو اپنے دل سے باہر نکالتا ہوں۔ اور جب سانس اندر جائے تو کلمہ الا اللہ کہے اور سمجھے کہ محبت الٰہی کو اپنے دل میں ثابت کرتا ہوں۔

لیکن بہت آسان اور حل مراحل سلوک کے واسطے مفید طریقہ یہ ہے کہ بے حرکت زبان اور بغیر امداد بہ برزخ شیخ کے ساتھ آہستہ آہستہ اسم اللہ ہر سانس میں دل کی زبان سے کہے۔ کیونکہ یہ اسم احدیت جل جلالہ اسم ذات ہے۔ اور شامل کفر و اسلام اور تمامی اسماء کا جامع ہے اور اسی اسم پاک کو اسم اعظم بھی کہتے ہیں۔

اور اگر طالب آتش شوق کو زیادہ مشتعل کرنا چاہتا ہو تو اسی اسم پاک اللہ کا ذکر اس طریقے سے کرے کہ اللہ کے ہا کو پیش کے ساتھ اس طرح پڑھے کہ جس سے واو پیدا ہو۔ اور سانس کھینچنے کے وقت اللا دل کی زبان سے کہے اور سانس نکلنے کے وقت ہُو دَم کے ساتھ کہے یہ ذکر آزادی اور موجودات عالم سے بے تعلقی پیدا کرتا ہے۔ اور خیال میں پختگی اور محبت میں ترقی ہوتی ہے۔

اور پاس انفاس میں اگر ذاکر کی ناک سے آواز پیدا ہو تو اس کو ناک کا ارہ کہتے ہیں۔ اور اس سے بہت شورش و سوزش اور دماغ میں حرارت پیدا ہوتی ہے۔

ذاکر کو لازم ہے کہ ذکر پاس انفاس کو کامل کرے اور کمال اسکا یہ ہے

کہ ذکر کرنے میں قلب ذاکر کو خاص لطف حاصل ہو۔ اور شوق میں ترقی ہو اور بغیر ارادہ اور کوشش ہر وقت اور ہر حالت میں دم ذاکر رہے۔

حضرات مشائخین نے مسافر عالم ملکوت کی آسانی اور ترقی مدارج کے واسطے شغل حبس نفس بھی تجویز فرمایا ہے۔ یہ شغل سیر ملکوتی میں رفیق صادق سمجھا گیا ہے۔ کہ طالب راہ طریقت کو منزل مقصود یعنی جو ار شاہد حقیقی تک پہونچاتا ہے۔

اس شغل کا نہایت مستند طریقہ حضرات صوفیہ کرام نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ بطریق جبوہ بیٹھے جو طرز نشست حضرت رسول کریم علیہ الصلوۃ والتسلیم ہے۔ اور احتوا بجائے ہاتھوں کے چادر سے کرے۔ اور آرنج ہر دو دست سر زانو پر رکھکر انگشت فر سے دونوں کانوں کے سوراخ اس طرح مضبوط بند کرے کہ راہ نفس مسدود ہو جائے اور پلکیں نیچی کر کے انگشت شہادت سے دونوں آنکھیں۔ اور اسی کے پاس والی انگلیوں سے ہر دو پرہ بینی اور لب اس اہتمام کے ساتھ بند کرے کہ سانس کے آنے اور جانے کی راہ نہ رہے۔ مگر پہلے داہنی جانب راہ نفس مسدود کرے اور بائیں جانب کے سوراخ کھلے رہیں۔ اور لا آلہ کا دم کھینچکر زیر دماغ لیجانے اور بعدہٗ اسی دم کو دل صنوبری کیجانب لائے اور فوراً بائیں طرف کے سوراخ بھی مستحکم طور پر بند کرے۔ اور حبس نفس اس وقت تک کرے کہ بے تصنع و کلفت دم برداشت کرے اور جب تحمل نہ ہو تو وہ انگلی جو بینی کے بائیں پرہ کو بند کئے ہے اس کو اٹھالے اور سانس کو بآہستگی اور بند رنج الا اللہ

کے ساتھ باہر نکالے۔ کیونکہ اگر اخراج نفس بتدریج نہ ہوگا تو دماغ کے واسطے باعث مضرت ہے۔

طالب طریقت کو لازم ہے کہ حبس نفس میں جہاں تک ممکن ہو قوت حاصل کرے۔ چنانچہ بعض شاغل ایک پہر تک حبس نفس کی قوت رکھتے ہیں۔ اور اکثر بزرگوں کے تذکرہ میں دیکھا ہے کہ وہ بعد نماز عشا اس شغل میں مصروف ہوتے تھے اور وقت نماز فجر تک حبس نفس فرماتے تھے۔

حضرت محبوب پاک غوث الثقلین نے اس شغل کا نام "آورد و برد" فرمایا ہے۔ اور اکثر حضرات صوفیہ اس شغل کو "زد و برد" اس لحاظ سے کہتے ہیں کہ اُونکا مقولہ ہے "ہر کہ این اسم شریف را بدل زد گوی مقصود برد" اور بعض متقدمین نے شاغل کی ترقی کے واسطے احتیاطاً طریق عمل مذکور میں اس قدر زیادہ کیا ہے کہ بعد حبس نفس شاغل کو لازم ہے کہ گاہ گاہ زبان دل سے لاالٰہ کہا کرے۔ اسلیئے کہ خالی بیٹھنے میں خطرات پیدا ہوتے ہیں۔ اور شاغل کے واسطے جمعیت خاطر لازمی ہے اور خطرات باعث نقصان ہیں۔

اور دوسری صورت سدّ باب خطرات کے واسطے یہ بھی ہے کہ محل خطرات و خدشات دل صنوبری ہے پس شاغل کو چاہیئے کہ درمیان حبس نفس دل مدوّرکی جانب متوجہ رہے۔ جس کا نام دل بیرنگ بھی ہے اور اس میں خطرہ کی گنجائش نہیں۔

اور دفع خطرات کے بارہ میں حضرات عاشقین نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ شاغل کو لازم ہے کہ خطرہ کو غیر نہ سمجھے۔ مگر اس کے واسطے یقین اور تصدیق کی ضرورت ہے۔

شغل حبس نفس کے واسطے خلوت بھی لازمی ہے اسلیئے شاغل کو چاہیے کہ تنہائی اور ایک وقت خاص میں یہ شغل کرے۔ اور وقت سیر و صحبت خلق میں پاس انفاس کا ذاکر رہے جو پہلے مذکور ہو چکا ہے۔

اگر شاغل بطریق مذکور اس شغل کا عمل کرے گا تو قوی امید ہے کہ بہت جلد آئینہ دل سے زنگ غفلت اور غبار کثافت زائل ہو جائے گا۔ اور خوشگوار حرارت اور خاص قسم کی لطافت قلب کو حاصل ہو گی اور شوق میں پختگی اور طلب دیدار شاہد حقیقی میں ترقی ہو گی۔

اور شاغل کی وسعت ہمت پر منحصر ہے کہ ممکن ہو تو شغل حبس نفس کے ہمراہ۔ یا عمل حبس نفس میں اگر کسی وجہ سے قاصر ہو تو بجائے حبس نفس کے جب تردداتِ و تخیلات سے قلب کو اطمینان ہو تو بکمال جمعیت خاطر لازم ہے کہ شغل سلطان الاذکار میں مشغول ہو کیونکہ اس مقدس شغل کا اشارہ احادیث صحیحہ میں بھی ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت کے قبل اور بعد بھی اس شغل کی جانب متوجہ رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت خدیجہ کبریٰ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تشریف لیجا کر اسی شغل میں مشغول رہتے تھے۔ اور تمامی بزرگان دین وحضرات

کاملین وعارفین بھی اسی شغل میں مشغول رہے اور اسی کے عمل کی ہمیشہ طالبین کو ہدایت فرمائی۔

مستند اور مفید طریقہ اِس کے عمل کا یہ ہے کہ شاغل کو لازم ہے کہ جب شغل سلطان الاذکار شروع کرے تو رات ہو یا دن ایسے صحرا میں جو تردداتِ اور ہجوم مردمان سے محفوظ ہو۔ یا ایسے حجرہ میں جہاں کسی کی آواز نہ آتی ہو بیٹھے۔ اور مقصود اصلی یعنی طلب الٰہی بہزار عجز و نیاز مطلوب حقیقی کی جناب میں پیش کرے اور شوق وصال حضرتِ ذو الجلال بکمال استقلال اپنے خیال کو درون دل اس طرح محبوس کرے کہ دیگر توہمات کا گذر نہ ہو۔ اور گوش دل کی جانب بغور د تامل ہمہ تن متوجہ ہو اور جہاں تک ممکن ہو اس توجہ میں فکر و کوشش کرے۔ اور اس کی سعی کرے کہ دوسرا خیال نہ آئے انشاء اللہ اُس کے بطون سے ایک آواز لطیف پیدا ہوگی اُس کو بغور سُنے۔ چنانچہ مولانا رومی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

بر لبش قفل است در دل رازہا
لب خموش و دل پر از آوازہا

اور یہ آواز بعض اوقات مثل جوشِ دیگ اور کبھی آواز زنبور کے مانند آتی ہے۔ چنانچہ کسی بزرگ کا قول ہے۔

نغمہا بانگ زنبوران نماید	چو اندر گوش ما گوید کلام او
ہمہ عالم گرفتہ آفتابی	زہے کورے کہ میگوید کدام او

یہ آواز سنکر شاغل کو یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ میری اسی ہیکل جسمانی میں یہ آواز محدود ہے۔ بلکہ یہ سمجھنا لازم ہے کہ اس صدای غیبی سے تمام عالم مملو ہے۔ **بقول۔**

صدای واحد القہار بینوش	برآور پنبۂ پندارت از گوش
جرگشتی تو موقوفِ قیامت	ندا می آید از حق بر دوامت

حضرات صوفیہ کا اتفاق ہے کہ کوئی شغل اس شغل سے بہتر نہیں ہے کیونکہ جملہ اشغال شاغل کی وسعت و اختیار پر موقوف ہیں۔ ایک لحظہ کے واسطے بھی اگر شاغل دوسری جانب مخاطب ہوتا ہے تو سلسلہ اس شغل کا منقطع ہوجاتا ہے۔ مگر یہ صوت سرمدی وہ شغل ہے کہ اس آواز کو جب شاغل سن لیتا ہے تو پھر ہمیشہ بے انقطاع و بے انفصال سنتا ہے۔ صرف تھوڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

حضرات صوفیہ کرام نے فرمایا ہے کہ آواز کی تین قسمیں ہیں۔ ایک وہ کہ دونوں ہاتھوں کے ملنے سے جو پیدا ہوتی ہے اسکو آواز محدث و مرکب کہتے ہیں۔ دوسری وہ کہ جو بے حرکت دست اور بغیر ترکیب الفاظ و غیر عنصر آتش و باد دردن شاغل سے پیدا ہوتی ہے اس کا آواز بسیط و آواز لطیف نام ہے۔ تیسری آواز بیحد ہے کہ بغیر واسطہ ہمیشہ ایک طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کو دخل نہیں۔ اور سبب اس کا یہی ہے کہ تمام عالم اسی صوت غیبی سے مملو ہے لیکن بجز حضرات اہل دل کے اوس

آواز کو دوسرا نہیں سنتا اس آواز کا صوت بیحد مطلق نام ہے۔ اور فقراء ہنداس کو انہد کہتے ہیں۔

چنانچہ شاغل جب اپنے بطون کی آواز سنتا ہے۔ اور اُس کی سماعت پر قادر ہوجاتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ آواز تمام عالم کی آواز پر غالب ہوجاتی ہے۔ اور ہر وقت اور ہر مقام پر وہ آواز بدستور محسوس ہوتی ہے اور پہلی آواز جو شاغل کے بطون سے پیدا ہوتی ہے۔ اور جس کو شاغل بگوش ہوش سنتا ہے وہ آواز گویا ایک قطرہ ہے اس دریائے ناپیداکنار کا جس کو صوت وہی کہتے ہیں اور جس سے تمام عالم کی صدائیں پیدا ہوئی ہیں

مشہور ہے کہ افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ تمہیں کہتے ہو کہ میرا پروردگار مجھسے باتیں کرتا ہے۔ حالانکہ وہ منزہ ہے جہات اور تعینات۔ حضرت کلیم اللہ نے فرمایا کہ ہاں میں کہتا ہوں کہ از جمیع جہات بغیر انقطاع و انفصال اور بے حرف و ترکیب میں آواز سنتا ہوں افلاطون نے تصدیق کی اور آپ کی رسالت پر ایمان لایا۔

علیٰ ہذا لقیاس حضور سرور عالم سے جب اصحاب نے نزول وحی کی کیفیت دریافت کی تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں آواز سنتا ہوں جو کبھی مثل آوازِ جوش دیگ اور کبھی مانند صدای زنبورانِ عسل کے ہوتی ہے اور کبھی فرشتہ بصورت ظاہر ہوتا ہے اور مجھسے باتیں کرتا ہے۔ اور کبھی مثل سلسلۃ الجرس کے آواز سنتا ہوں۔ چنانچہ اسی مضمون کو لسان الغیب حضرت حافظ شیرازی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔

کس ندانست کہ منزلگہ مقصود کجاست

این قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

اور مولانا عبد الرحمٰن جامی علیہ الرحمتہ نے بھی یہی مضمون نظم فرمایا ہے۔

در قافلہ کہ دوست دائم نرسم

این بس کہ رسد بگوش بانگ جرسم

غرض نزول وحی کے وقت جو کیفیت آپ کی ہوتی تھی اور جسکو یہ تمثیل و تفصیل حضور نے ارشاد فرمایا اسکا اشارہ صریح سلطان الاذکار کی جانب ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام نے جب یہ صدائے غیبی سنی تو بلحاظ شرف واختصاص اُن کی یہ حالت ہوئی کہ آیات وحی اور احکام الٰہی سے خبردار ہوئے۔ اور اولیاء کبار کو اس آواز بے انقطاع سے جمعیت خاطر ہوتی ہے اور خوشگوار لذت ملتی ہے اور وجد و ذوق میں ترقی ہوتی ہے۔ اور اس آواز لطیف کی جانب ایسے محو اور مستغرق ہوتے ہیں کہ جملہ اشغال اُن سے چھوٹ جاتے ہیں اور معلومات اور موجودات سے بےتعلق ہوکر شغل بے شغلی میں مشغول ہوگئے ہیں جسکو عرف صوفیہ میں فنا کہتے ہیں۔

حضرات عارفین کے ارشاد سے یہ ثابت ہے کہ یہ صوت غیبی کبھی مثل آواز جوش دیگ اور کبھی صدائے زنبوران عسل کی طرح اور کبھی آواز جرس ناقہ کے مانند محسوس ہوتی ہے اور یہ بھی ثابت ہوا کہ یہ آواز بے واسطہ اور بے حرف و ترکیب ہوتی ہے جس میں تغیر و تبدل کا دخل نہیں تو سوال یہ ہوتا ہے کہ آواز یکساں کیوں نہیں آتی اور یہ اختلاف کیوں ہے۔

گو حضرات صوفیہ نے اس کو دوسری لفظوں میں بھی سمجھایا ہے مگر میں نے معتبر طریقہ سے یہ سُنا ہے کہ اس کا احساس شاغل کے مدارج پر موقوف ہے۔ چنانچہ پہلے شاغل کو مثل جوش دیگ آواز آتی ہے۔ اور جب شوق میں ترقی ہوتی ہے تو اسی آواز کو وہ مانند صدائے زنبور کے سنتا ہے اور جب تکدرات جسمانی پر روحانیت غالب ہوتی ہے تو بقول حافظ شیراز "بانگ جرسے می آید"۔

لیکن شاغل کو لازم ہے کہ جب اس آواز دہی کی سماعت نصیب ہو تو اس کے تحفظ اور نگہداشت میں کامل سعی اور کوشش کرے تاکہ یہ آواز صحرا اور حجرہ میں بھی سُنائی دے اور مجمع خلائق میں بھی محسوس ہو۔ کیونکہ یہ شغل کامل اسی وقت سمجھا جاتا ہے کہ دُف اور ڈھول اور نقارہ وغیرہ کی آواز پر یہ صدای سرمدی غالب ہو۔ اس لئے کہ یہ اصل ہے اور موجودات عالم کی جملہ صدائیں اسی آواز سے عالم ظہور میں آئی ہیں۔ چنانچہ اکثر اس کے شاغل مجمع خلائق اور گذرگاہ عالم میں صرف اس واسطے بیٹھتے ہیں کہ دریافت کریں کہ یہ شغل مرتبہ کمال کو پہونچ گیا یا نہیں۔ اور تکمیل اس کی وہی ہے کہ ہر قسم کی آواز پر یہ باطنی آواز غالب ہو۔

اگر تائید ایزدی سے طالب کی یہ حالت بھی ہو جائے تو مقام شکر ہے ورنہ اس کے آگے جو مقام ہے وہ گذرگاہ عام نہیں۔ لیکن سلسلہ کے لحاظ سے وہ حالات بھی نگارش کرتا ہوں جو طالب اہ حقیقت

کو آئیدہ پیش آتے ہیں۔ چنانچہ حضرات عارفین نے فرمایا ہے کہ جب شاغل کو شغل سلطان الاذکار میں پوری مہارت حاصل ہوتی ہے تو قلب شاغل پر ایک حالت اور کیفیت طاری ہوتی ہے اور دل شاغل سے دریائے حقیقت جوش زن ہوتا ہے کیونکہ سرچشمۂ حقیقت وجود انسان ہے اس وقت شاغل کو خود بخود یقین ہو جاتا ہے کہ جملہ موجودات کی صدا اور ندا اسی آواز غیبی سے ظاہر ہوئی ہے۔ اس تصدیق کے ساتھ شاغل کے تکدرات جسمانی پر روحانیت غالب ہو جائے گی اور دل میں شاہد حقیقی کے وصل و دیدار کا شوق پیدا ہو جائے گا۔ اور روح عالم ارواح کیجانب رجوع ہوگی اور شاغل کی اسی حالت اور کیفیت کا نام عرف صوفیہ میں عالم جبروت ہے اور اسی عالم کو عالم احدیت اور عالم جمعیت اور عالم آرام اور عالم تمکین اور عالم بے نقش بھی کہتے ہیں۔

حضرات صوفیہ کا یہ قول ہے کہ "تصوف آنست کہ ساعتے بنشینی بے تیمار"۔ اور بے تیمار کی تشریح یہ فرمائی ہے کہ "دریافت بے جُستن و دیدار بے نگریستن کہ بینندہ در دیدار علت است" پس یہی تعریف عالم جبروت کی ہے۔ کہ طالب و مطلوب شاہد و مشہود میں فرق و امتیاز نہیں رہتا۔ اور جو کچھ عالم ناسوت اور عالم ملکوت میں ہے وہ سب عالم جبروت میں ہے۔ اور سیاح بادیہ حقیقت جب اس مقام پر پہونچتا ہے تو صفحۂ دل سے خواہشات و مرادات کا

نام تو ہو جاتا ہے۔ اور حالت محبوبیت میں مستغنی ہوتا ہے۔ اور آرام بالائے آرام اور جمعیت بالائے جمعیت نصیب ہوتی ہے۔

اس کے بعد طالب کی یہ حالت ہوتی ہے کہ دریائے ہُویت میں غرق اور محو ہوتا ہے۔ پھر عبد و معبود کا تفرقہ نہیں رہتا۔ بے واسطہ عین ذات سے سروکار ہوجاتا ہے۔ طالب کی اسی حالت کو اصطلاحات صوفیہ میں عالم لاہوت کہتے ہیں۔ اور اسی کو عالم ہویت اور عالم ذات اور عالم بیرنگ اور عالم اطلاق اور عالم بے جہت بھی کہتے ہیں۔ اور یہ عالم اصل و محیط عالم ناسوت و ملکوت و جبروت ہے۔ جملہ عالم اسی ایک عالم سے ظاہر ہوئے ہیں۔ اور یہ عالم بغیر تبدل و تفاوت یکساں اور قدیم ہے۔ هُوَالْاَوَّلُ هُوَالْاٰخِرُ هُوَالظَّاهِرُ هُوَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ۔

طالب کو جب یہ سعادت لایزال اور دولت بے زوال نصیب ہوتی ہے تو اسرار حقیقت اور رموز احدیت سے آگاہ ہوتا ہے۔ اور شان ہمہ اوست نظر آتی ہے۔ یہی وہ حالت ہے جس کو حضرات صوفیہ نے فرمایا ہے کہ "چارہ غیر ازین نیست کہ خود را عین او دانی و در بند پندار من و تو در نمانی" یہی مقام حقیقت توحید و تجلی ذاتی ہے "وَفِىْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ"۔

طالب کو چاہئے کہ اس حالت میں دل کو وہم و وسواس سے صاف

و پاک رکھے۔ تعینات کو حجاب ذات نہ جانے بقول

ہرگز نکند آب حجاب اندر یخ

یا آنکہ کند نقش حباب اندر یخ

اور اگر کوئی خطرہ پیدا ہو تو اس کو عین ذات جانے۔ حتیٰ کہ یہ نسبت کامل ہو جائے چنانچہ حضرات عارفین کا فرمودہ ہے کہ اگر طالب راہ طریقت نے موجودات عالم میں ایک ذرہ کو بھی اُس آفتاب احدیت سے جدا سمجھا تو وہ نعمت توحید و عرفان سے محروم رہا۔ اسلئے کہ جمیع کائنات میں جملہ موجودات کی اصل ذات حضرتِ واحد الوجود ہی ہے۔ گو نام سب کے جُدا ہیں لیکن ذات اور حقیقت میں سب یکساں ہیں۔ چنانچہ کسی صاحب توحید کا قول ہے۔

توحید بگویم ار بفہمے یارا — موجود نگشتہ ہیچگہ غیر خدا

این راکہ تو می بینی و میدانی غیر — در ذات ہمہ یکیست در نام جدا

مثلاً پانی جب تک بستہ نہیں ہے بے صورت اور بے رنگ ہے اور جب بستہ ہوا تو اُس کے یخ اور برف اور ژالہ نام ہو گئے لیکن حقیقت یخ اور برف اور ژالہ کی وہی آب بسیط اور بے رنگ ہے۔ پس صاحب چشم حقیقت بین پانی کو جمیع مراتب و کیفیات میں پانی جانیگا بقول

در ذاتِ وجود صرف ذاتِ وہاب — ارواح نفوس ہمچو نقش اندر آب

بحریست کہ موج میزند اندر خود — گہ قطرہ گہیست نقش و گاہیست حباب

ذاتِ حضرتِ احدیت جل جلالہ کا عرفان یہی ہے کہ اپنی اصل اور حقیقت

کو پہچانے۔ کیونکہ جملہ موجودات کی ہستی او رنمود اسی ذات سے ہے اور وہی ایک آفتاب ذاتِ احدیت تمام عالم کی مختلف آئینوں میں جلوہ گر ہے۔ جیسا کہ نقش اور لفظ کو اگر بغور دیکھا جائے تو یہی ثابت ہو گا کہ وجود ان کا ایک سیاہی سے ہے۔ یا بیج۔ شاخ۔ برگ۔ گل۔ میوہ ایک تخم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور باایں ہمہ کثرت مانع وحدت نہیں۔ لہذا قید حجاب و تعینات مانع ذات وحدانیت نہیں ہو سکتے۔ بقول

گویم سخنے زروی تحقیق و ثواب گر مرد رہے قبول کن در دی متاب
ہرگز نشود صفات بر ذات حجاب کے نقش بر آب مانع دست بر آب

غرض محققین نے شاغل کے واسطے شغل آئینہ تجویز فرمایا ہے۔

"ہر کہ جز خود بنظر در آید عین خود فہمیدن و ہمہ را یک ذات دیدن خود بخود لذت گرفتن است" بقول

یار لیلیٰ وش من غیر من مجنون نیست
شمع از دائرۂ پرتو خود بیرون نیست

یہ نسبت کہ اپنی اصل حقیقت کو پہچانتا اگر تصدیق کے ساتھ نصیب ہو جائے تو انسان کے واسطے یہی علوی مرتبت اور غایت عرفان ہے کہ بادیہ غفلت کی نادانی و سرگردانی اور وسواس و تخیلات من و تو سے فارغ ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے کہ طالب کے قلب مطمئن پر آفتاب وحدت اپنی تجلی فرماتا ہے حجاب تعینات اٹھ جاتے ہیں۔ اور ذکر و ذاکر و مذکور کا فرق و امتیاز نہیں رہتا۔ طالب کے صفحۂ دل سے رنج و ترس و غم

وخیال دبیم و ہراس و دوری و مہجوری کا نام محو ہو جاتا ہے۔ عین ذات سے سروکار ہوتا ہے۔ اَنْزَلَ السَّکِیْنَۃَ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ کا مژدہ سُنتا ہے۔ اور بشارت لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ سے سرفراز ہوتا ہے۔

غرض پیشوائے کامل طالب راہ حق کی تعلیم یہیں تک کرتے ہیں اور یہی دقائق سمجھا کر خدا کے سپرد کرتے ہیں کہ آگے تعلیم کی گنجایش نہیں گو میری تحریر کا یہ آخری حصہ جسکو اذکار و اشغال سے تعلق ہے ضرور کسی قدر مطول ہو گیا۔ مگر یہ طوالت بھی بخیال صراحت اور بلحاظ وضاحت ہوئی ورنہ مقصود میرا یہی تھا کہ صرف شغل سلطان الاذکار کے قواعد اور فوائد نگارش کر دوں۔ اور یہی میرا خیال ہے کہ طالبِ راہ طریقت کے واسطے یہی دو طریقے زیادہ آسان اور مفید ہیں اول تصور شیخ جو ابتدا سے انتہا تک رفیق صادق اور محافظ حال رہتا ہے بلکہ یہ بھی کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ طالب کی ترقی اور تمامی حل مشکلات پیشوائے کامل کے تصور پر موقوف ہیں۔ اس لئے طالب کو تصور شیخ میں مشق اور مہارت کامل حاصل کرنا ضروری اور لازمی ہے۔ دوسرا طالب کی کامیابی کے واسطے آسان طریقہ شغل سلطان الاذکار ہے۔ اگر طالب سمجھدار یعنی طلب صادق رکھتا ہے اور دل میں جوش محبت اور شوق وصال ہے، خواہ فطرتاً یہ سعادت اس کو نصیب ہوئی ہے یا اور اور وظائف اور اذکار و اشغال میں کچھ دنوں مشغول ہو چکا ہے جسکی وجہ سے

قلب طالب میں حرارت عشق موجود ہے تو چند روز بھی اگر وہ سعی اور کوشش کیساتھ طریقہ مذکور کے مطابق عمل کرے گا تو انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوگا۔

مگر یہ ضرور ہے کہ طالب ہمہ تن مصروف ہوجائے اور طلب صادق کے ساتھ کوشش کرے۔ یہ نہ ہو کہ زبان سے تو عشق الٰہی کا دعویٰ اور دل محبت دنیا میں منہمک رہے۔ اگر بقول حضرت مولانا علیہ الرحمتہ "برزبان تسبیح و در دل گاؤ خر" کا مضمون ہوا تو دعویٰ عشق بھی باطل ہے اور یہ سعی اور کوشش بھی لاحاصل کیونکہ خدا کا ملنا آسان نہیں اور وہ ترقی جو انسان کا غایت عروج ہے باتوں سے حاصل نہیں ہوتی۔

کاش جس مستعدی سے ہم معشوق مجازی کے لئے جستجو کرتے ہیں اور ایک حادث اور فانی مطلوب کے خیال میں محو اور مستغرق ہوجاتے ہیں اور اُس کے فراق کی تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اگر اپنے شاہد حقیقی کی تلاش میں کم سے کم اسی قدر سرگرمی سے سعی اور کوشش کریں اور اسکی محبت میں ثبات و استقلال کے ساتھ معمولی تکلیف بھی گوارا کریں تو واللہ بیڑا پار ہے

لیکن افسوس اِس کا ہے کہ ہم زبان سے یہ تو کہتے ہیں کہ وہ معبود مطلق اور خالق برحق ہے اور اُسی کی ذات اقدس ہماری اس ہستی کی اصل ہے مگر چونکہ تصدیق کامل نہیں اس لئے اگر خدا کے طالب ہوتے ہیں تو اس بدعنوانی سے کہ دنیاوی مرادات و خواہشات کی طلب اگر حضرت باری جل جلالہٗ کی طلب سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں ہوتی۔ اور یہ نہیں خیال کرتے کہ ایسی طلب بالکل بے سود اور غیر مفید ہوتی ہے اور ہم غلط

خواہی دہم دنیائے دون" کی مصداق ہے
خدا کی طلب اور محبت اسی وقت ہوتی ہے جب تمامی تعلقات سے انقطاع اور خواہشات موجودات سے دل معرا ہو۔ ایسے ہی دل کے لئے کَتَبَ فِی قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانِ "۔ کی بشارت ہے۔ اور ایسے ہی دل کی یہ تعریف ہے کہ "دل گذرگاہِ جلیلِ اکبرست" اور جنکو ایسا دل نصیب ہوتا ہے وہی خدا کے مقبول اور محبوب ہوتے ہیں اور درحقیقت وہی لوگ اہل دل ہیں۔ ورنہ ایک ہمارا دل ہے جو صورتاً تو ویسا ہی دل ہے مگر سیرت کو دیکھا جائے تو زمین اور آسمان کا فرق ہے جس میں سوائے خواہشات نفسانی کے نہ طلب الٰہی نہ شوق وصال نہ جس میں سوز محبت کا اثر ہے۔ اس دل کا نام تو دل ضرور ہے مگر یہ دل مثل جانوروں کے دل کے ہے جو قصاب کے دروازہ پر بے قدری کے ساتھ پڑے رہتے ہیں۔ اور جنکو لوگ تنفر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بقول

آنچہ بصورتِ دل انسان بود | بردرِ قصاب فراوان بود
دل اگر این تو دہ آب و گل است | خر ہم از اقبال تو صاحبدل است

یہ دل بیکار ہے اور ایسے ہی دل کی نسبت کسی نے فرمایا ہے۔

نہ بدرد آشنائے نہ بعشق راہ دارد۔
بچہ کار آید این دل کہ کسے نگاہ دارد

غرض طلب الٰہی کے واسطے پُر درد اور آزاد دل کی ضرورت ہے جو راہ طریقت میں شاہد حقیقی کے شوق و خیال میں محو اور مستغرق در موجودات

عالم سے دست بردار رہے۔ خصوصاً شغل سلطان الاذکار میں جس قدر یکسوی دیکھتی ہوگی اسی قدر جلد کامیابی کی امید ہے۔ کیونکہ یہ توحید کی مشق ہے جس میں دوئی کی گنجایش نہیں۔ بلکہ کمال اسکا یہ ہے کہ شاغل کے دل میں ماسوای ذات احدیت غیر کا خیال بھی نہ آوے۔ چنانچہ بزرگوں کا یہ فرمودہ کہ "خیال پختہ کردن وخود را فراموش کردن کار مردان است" اسی کی دلیل ہے۔

اور دیکھا تو میں نے یہ ہے کہ بغیر مشق حبس نفس وغیرہ طالب کو تین روز میں سماعت صوت سرمدی نصیب ہوگئی۔ لیکن اس کو یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ شاغل کی فکر وکوشش کا نتیجہ تھا۔ بلکہ اصل یہ ہے کہ پیشوائے کامل کی توجہ اور فیضان باطنی کا یہ کرشمہ تھا۔

اور یہ شغل زیادہ مفید اس وجہ سے ہے کہ اول تو جملہ حضرات عارفین کا اتفاق ہے کہ طالب کی ترقی مدارج کے واسطے سلطان الاذکار سے بہتر کوئی شغل نہیں ہے۔ علاوہ اس کے یہ شغل تعلقات موجودات کو زائل اور وسواس وتخیلات سے قلب شاغل کو پاک کرتا ہے۔ اور تکدرات جسمانیہ پر روحانیت غالب ہوتی ہے۔ اور ذات حضرت احدیت سے سروکار رہوتا ہے کہ من وتو کا جھگڑا پھر نہیں رہتا۔

اور بفرض محال اگر کسی وجہ سے طالب کو شغل سلطان الاذکار

میں پوری کامیابی نہ ہو تو بھی جو عین مقصود ہے وہ حاصل ہو جاتا ہے کہ شاغل جس حالت میں رہے گا اُس کو حق سبحانہٗ تعالیٰ سے تھوڑا یا بہت سروکار ضرور ہو گا۔ اور ذات حضرتِ الوہیت جل جلالہٗ سے معمولی سروکار بھی کافی اور بس ہے۔

الغرض طالب راہ طریقت کے واسطے شغل مذکور یقینی مفید ہے۔ اگر صدق اور خلوص کے ساتھ کوشش کرے گا تو ایسی آسانی سے کامیاب ہو گا جو دوسری صورت میں ممکن نہیں۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ جس قدر تصریح اور توضیح اس کی نگارش کی ہے یہ عام فہم ہے کسی کو اس کے سمجھنے میں دشواری نہ ہو گی۔ لہٰذا یہ رسالہ اس عذر اور التماس کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ ناظرین میری اس تحریر میں جہاں غلطی ملاحظہ فرمائیں تو اُس کو دامن اصلاح و بخشش سے چھپائیں۔ وَالسَّلَامُ مُخَیرِ خِتَامُ ؕ

بزرگان خوردہ بر خورداران نگیرند

برحمت عذر ایشان در پذیرند

نور سنز پریس
پرنٹنگ اینڈ بائینڈنگ
حاجی شہزاد وارثی راولپنڈی
(نیول)

Scanned with CamScanner